آثارِ اقبال

مرتبہ: غلام دستگیر رشید

لکھنے والے

(۱) رئیس الامراء محمد علی [illegible]
(۲) حکیم الامت علامہ اقبال مرحوم
(۳) [illegible] یار جنگ مرحوم
(۴) ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
(۵) مولانا اسلم جیراجپوری
(۶) محمد مشتاق علی خاں
(۷) پروفیسر میر ولی الدین
(۸) پروفیسر رشید احمد صدیقی
(۹) پروفیسر خواجہ عبدالحمید
(۱۰) پروفیسر محمد مجیب
(۱۱) پروفیسر عبدالقادر سروری
(۱۲) پروفیسر غلام دستگیر رشید
(۱۳) حامد علی خاں
(۱۴) عاشق حسین بٹالوی
(۱۵) [illegible] محمد (رشحاتی)
(۱۶) سید وحید اشرف [illegible]
(۱۷) منشی عبدالحق
(۱۸) شاہد حسین رزاقی

سید عبدالرزاق تاجر کتب حیدرآباد دکن
مالک ادارۂ اشاعت اردو

[illegible]　　　　[illegible]

طبع اول ——— ایک ہزار ——— ماہ دسمبر ۱۹۳۳ء

طبع دوم ——— ایک ہزار ——— ماہ مارچ ۱۹۳۶ء

ناشر

سید عبدالرزاق تاجر کتب عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن
مالک ادارۂ اشاعت اردو

مطبوعہ

رزاقی مشین پریس حیدرآباد دکن

فہرست

گزارش	محمد اقبال سلیم گاہندری	۵
اقبال کا شاہین زادہ	فقیر [illegible] مرحوم	۲۳
اقبال کی زندگی	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم	۲۷
علامہ اقبال کی خدمت میں چند لمحے	ڈاکٹر عاشق بٹالوی	۳۵
سر اقبال دستاویز میں	حامد علی خاں	۴۵
اقبال کے ملی جواہر ریزے	پروفیسر خواجہ عبدالحمید	۵۳
یوم اقبال	مولانا اسلم جیراجپوری	۸۵
ذکر اقبال	پروفیسر محمد مجیب	۹۱
اقبال (حیات اور شاعری)	پروفیسر عبدالقادر سروری	۹۹
کلام اقبال کا تحلیلی مطالعہ	غلام محمد بی۔ اے (شاشی)	۱۳۹
اقبال اور حدیث جبر و قدر	ڈاکٹر شیخ ولی الدین صدر شعبہ فلسفہ جامعہ عثمانیہ	۱۶۳

اقبال کا نظریۂ ادب	خواجہ غلام السیدین	۱۸۵
اقبال حضورِ رسالت میں	سید وحید اللہ وحید	۱۹۳
تعلیماتِ اقبال	مولانا محمد علی مرحوم	۲۰۳
اقبال درحضورِ آدم	غلام دستگیر رشید پروفیسر نظام کالج	۲۰۹
فلسفۂ بیخودی	پروفیسر رشید احمد صدیقی	۲۱۳
نظمِ اقبال پر ایک اجمالی تنقید	محمد اشفاق علی خاں	۲۳۳
تشریحِ اقبال	ڈاکٹر سید عبداللہ ایم اے	۲۶۱
اقبال اور وطنیت	شاہ حسین رزاقی ایم اے	۲۹۱
اقبال اور معاشیات	علامہ اقبالؒ	۲۹۹
محفلِ میلاد النبیؐ اور اقبال	علامہ اقبالؒ	۳۰۵
عقیدۂ توحید اور اقبال	مولانا نذیر الحق	۳۱۰

گزارش

کیا ہی بات کہی تھی علامہ اقبال نے کہ

"بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"

اہل چمن کی انتہائی بدنصیبی ہوتی اگر "دیدہ ور" کے نغموں کو بھول جاتے لیکن اہل چمن نے علامہ اقبال کے نغموں کو نہیں بھلایا! اور شاید کبھی نہیں بھلائیں گے۔ اب تک اقبال کی زندگی اور ان کے افکار پر اتنا لکھا جا چکا ہے کہ اقبال کا مطالعہ کرنے والا کئی درجن کتابوں کا محتاج ہو گیا۔

جناب غلام دستگیر صاحب رشید ایم۔ اے نظام کالج کا

ہم سب پر احسان ہے کہ انھوں نے ایسے مضامین کو جن کے بغیر اقبال کو اچھی طرح نہیں سمجھا جا سکتا یکجا کر دیا۔

اب تک کتاب "افکارِ اقبال" کے ذریعہ آپ کو تقریباً کئی مشاہیر اہلِ قلم کے رشحاتِ قلم سے واقفیت ہو سکتی ہے۔ بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اب تک اقبال پر اس سے جامع اور مفید کتاب نہیں لکھی گئی۔ انتخابِ مضامین کے لئے فاضل مرتب کا نام ضمانت ہے کہ اس میں صرف جواہرات ہی جمع کئے گئے ہیں۔

اس سلسلہ کی دوسری کتابیں "فکرِ اقبال" اور "ذکرِ اقبال" ہیں۔ فکرِ اقبال میں علامہ اقبال کے حکمت و فلسفہ کے بنیادی موضوعات پر بلند پایہ مفکرین کے مباحث و مضامین درج ہیں۔

(چوہدری) محمد اقبال سلیم گاہندری
ستمبر ۱۹[illegible]ء

شمع کی طرح جئیں بزمِ گہِ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

اقبالؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حریفِ بادہ پیما کی یاد میں

حسبِ معمول ۲۵ جون ۱۹۴۴ء اتوار کے دن شام کو "بیت الامّت" دولت کدۂ بہادر یار جنگ مرحوم میں جہاں اقبال کی حکمت آموز اور دل سوز صحبت جاری تھی حلقۂ اقبال رح کے بانی اور محبِ اقبال رح کے شیدائی "قائد ملت لسان الامّت بہادر خاں مرحوم جن کی سراپا جہاد زندگی خود ع

"بس اللہ بس باقی ہوس"

کے مصداق تھی۔

یعنی تنگی اور ظلمت کو دور کرنے والی حرکت سے اس میں سے

پیالہ بر کف ساز و تجلیش بر سر نام را — تازہ غوغائے دہد ایام را

کا رنگ پیدا کر رہے تھے۔

جب میں "مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کی جلالی و زریں نظم "حکمت کلیمی" کے اس شعر سے

مرد حق افسون ایں دیر کہن — از دو حرف ربی الاعلیٰ شکن

سے آگے بڑھنے لگا تو فرمایا "رشید صاحب! یہ مقامات جلد گزرنے کے نہیں ہیں۔ آج یہیں ٹھہر جائیں۔" میں نے کہا "بہت خوب! تو یہ خبر تھی کہ یہ "مرد حق" وہ ایک ہی شخص کے اندر اس دیر کہن کے افسوں کو توڑ کر اپنا راز "عشق شعر اقبال" سناتے ہوئے "ربی الاعلیٰ" سے جا ملے گا اور تعلیم اقبال کا یہ پیکر عمل اپنے "حریفان بادہ پیما" کو سے

غیرت او بر نتابد حکم غیر — تیغ سلطاں در نگاہش کہنہ دیر

کے شعار سے تا قیامت محروم کر دے گا!

"آشنائے اقبال" کو اس کی "حکم غیر" کو نہ برداشت کرنے والی "غیرت حق" اور سراپا پیام انقلاب نگاہ کی یاد سے منسوب کرتا ہوں کہ پیر مغاں حافظ کا حکم ہے سے

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی
بیاد آر حریفان بادہ پیما را

دانش
رشید

یاران نکتہ دان کے لیے

"رمز آشنائے روم و تبریز" "برہمن زادہ" اقبال کا کلام ایک بیکراں سمندر ہے جس میں اضطراب موج و سکون گہر کے "دونوں جہاں" جلال و جمال پوشیدہ ہیں۔ اس کا ہر شعر ایک "دلیل راہ" ہے اور اس کا ہر حرف "ایک دفتر معنی" وہ دانا صاحب دل ہے جو انسان کے "وحدت مدعا" کو بلند اور محکم تر بناتا ہے اور اس مدعا کی تکمیل کرنے والے "حلقۂ آئین" کو مضبوط تر کرتا ہے۔ اس کی "مئے ناب" کے ایک ساغر سے محفل کی محفل رنگین ہو جاتی ہے۔ حکمت اقبال ہر خام کو پختہ بناتی ہے اور زمانہ کو ایک نیا انقلاب بخشتی ہے۔ اس کا پیغام "رگ تاک" میں "آگ" اور

«مشتِ خاک» میں «جانِ پاک» پیدا کرتا ہے۔ اس کی نظر نگرانِ فطرت اور اس کا ضمیر خلاقِ فطرت ہے۔

شعرِ اقبال کو کوئی ایک موضوع لیجئے۔ اس عنوان سے متعلق ان کے مختلف تصورات اور احساسات ہیں۔ لیکن ان میں سب کے سب یا اکثر ایک ہی جگہ نہیں مل سکتے۔ مختلف وجوہات اور اعتبارات سے ان احساسات و نظریات کا اظہار مختلف نظموں میں بلکہ ان سے بھی زیادہ مختلف کتابوں میں ہوا ہے۔ اگر ہم کسی ضرورت سے بھی چاہیں کہ ایک ہی موضوع پر ان کے نظریات و حسیات کا یکجا مطالعہ کریں تو مشکل درپیش ہوتی ہے۔ مختلف موضوع سے متعلق منتخب مقالات کی طلب اور ان کی قدر و قیمت ایسے ہی موقع پر محسوس ہوتی ہے۔ گلستان میں بھی «چشمِ تنگ» کثرتِ نظارہ سے وا ہوتی ہے لیکن اپنے اپنے ذوقِ رنگ و رم میں گلدستے بھی «جنتِ نظر» سے کم نہیں ہوتے۔

جس طرح اقبال کا ہر شعر اور ہر خیال ایک تازہ اندازِ نظر پیدا کرتا ہے اسی طرح ہر اہلِ نظر اپنی صلاحیت اور مناسبت سے «گلستانِ اقبال» کو ایک نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور اس کا علم «جلوۂ حیرت» اور اس کا عشق عمل پر مزید قدرت پاتا ہے۔ اقبال کے «بادۂ تند» سے اہلِ ذوق نے پینے اپنے کئی جام بھرے ہیں۔ ہر جام بہ عنوانِ نو «پیش» کیا ہے۔ کئی کا ظرف ذی

میخانے آباد کر رکھے ہیں۔ یہ سالہا سال کے اخبارات اور رسالوں کے اوراق پر پھیلے ہوئے ہیں۔ "حریفانِ بادہ پیما" کو ہر وقت ان کا پتہ نہیں چلتا۔ اہم تالیفات کے ظہور اور قبول کا بڑا سبب یہی ہے۔

جب کبھی کسی پُر مغز اور نفیس مقالہ کا ذکر اہلِ ذوق سے کیا جاتا ہے تو فوراً سوال ہوتا ہے "بھائی ذرا ہمیں بھی دیکھنے کے لئے دیجئے"۔ اب مرغی اور انڈے کا چکر شروع ہوتا ہے۔ جس نے پڑھا اس مضمون کی خوبی کا ہوتا اشتہار بن گیا۔ جس کسی نے سنا اس نے نکالنے کا مطالبہ سے جلا۔

آثار اقبال، فکرِ اقبال یا ذکرِ اقبال جیسی تالیفات کی ترتیب و اشاعت کا اصلی مقصد اسی نوعیت کے مطالبات کے ایک وسیع حلقہ کی تعمیل و تکمیل ہے۔

اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کئی مضمون ایسے ہیں جو آپ کو ترجمانِ حقیقت کی صحبت میں پہنچا دیتے ہیں۔ وہاں آپ ان کے اقوال، ملفوظات، ارشادات اور لطائف سے مستفید ہوتے ہیں۔

بزمِ ادب و حکمت میں اس دورِ جام کے آپ تک آنے کی ذمہ داری جناب شیخ عبدالرزاق صاحب اور جناب اقبال عظیم صاحب چوہدری کے مستعد

ہاتھوں پر ہے۔ ایسے ہی مستعد اشاعتی اداروں کی بدولت ہم کتنے اہلِ علم و صاحبانِ قلم کے گروہ سے بھی ملاقات کرتے ہیں جس کی تعریف حضرت حافظؒ کے الفاظ میں یہ ہے ؎

خوش می دہد نشانِ جلال بجمالِ یار
خوش میکند حکایتِ عز و وقارِ دوست

نیاز کیش
غلام دستگیر رشید
ایم اے

اقبال کا شاہین زادہ

محمد نیاز خاں مرحوم تھا۔ فمت کی وہ تقریر جو انھوں نے ایک سال یعنی زبان بندی کے بعد ۲۱ اپریل ۱۹۳۹ء کو یوم اقبال کے موقع پر کی۔

میرے دوست فضائے حیدر آباد نے مجھے اس طرح ناشاد ہو کے تھے کہ مجھے اب بھی یاد تھا کہ آج تقریر کرنی ہے۔ آج سے ڈیڑھ سال قبل علامہ اقبال کی زندگی میں اقبال کے تصورِ مومن کو پیش کر کے خود ان سے داد حاصل کی تھی۔ لیکن آج ان کے انتقال کے بعد مختصر دیباچہ عقیدت ان کی سرمدی اور ابدی دعا کی امید پیش کر رہا ہوں۔

اقبال کے پیغام کا سب سے نمایاں مقصد مسلمان کی خودی کو بیدار کرنا ہے۔

اپنے پورے کلام میں انھوں نے اسی چیز کو بہ انداز مختلف پیش کیا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے اس کے لیے جو تشبیہیں اختیار کیں ان میں سب سے زیادہ نمایاں شاہین اور شاہین زادہ کی تشبیہ ہے وہ بتانا چاہتے ہیں کہ مسلمان کرگسِ خاکی نہیں بلکہ شاہینِ بلند پرواز و فضا پیما ہے۔ اقبال کے کلام کا رنگ شاہ بازی کہلاتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مسلم کا مقام صحبتِ مرغِ چمن نہیں بلکہ وسعتِ ارض و سما ہے۔

اس سلسلے میں انھوں نے فطرتِ انسانی کے بہت سے پوشیدہ گوشوں کو نمایاں کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان جب محنت و مشقت کے بغیر رزق حاصل کرنے لگتا ہے اور اس کا عادی بن جاتا ہے تو اس کی بہت سی ایسی صلاحیتیں اس سے چھن جاتی ہیں جن پر اس کی باعزت انفرادی و اجتماعی زندگی کا مدار ہے۔ ان انسانی صلاحیتوں میں سب سے ضروری اور اہم صلاحیت انسان کی شجاعت اور اس کا جذبۂ عزتِ نفس ہے اور مفت خوری کا اثر سب سے زیادہ اسی صلاحیت پر پڑتا ہے اور شجاعت و بلند ہمتی جبن اور پستیٔ خیال سے بدل جاتی ہے۔ اسی کو اقبال نے اس شعر میں بڑے اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر شاہین بچوں کو بھی پابندِ قفس کر کے عطائے صیاد کا امیدوار بنا دو تو چند روز میں وہ چڑے کی پھڑپھڑاہٹ سے بھی لرزہ براندام ہو جائیں گے۔

تپش آزمائے بالِ تدروے لرزہ می گیرد
چو شاہیں زادہ اندر قفس با دانہ می سازد

تم غور کرو کہ حیدرآباد کا مسلمان گزشتہ دو سو سال سے اندر قفس با دانہ ساختن کا عادی نہیں ہو گیا ہے اور کیا اسی کے نتیجے کے طور پر آج اس شاہین زادہ کی روح سایۂ بالِ تدروے لرزہ براندام نہیں ہے۔

اقبال کے نزدیک آرام و راحت زاغ و زغن کا کام ہے اور قید و صید کی بلند نشینی قسمتِ شاہین کی سعادت اور جب تک کوئی ان مرحلوں سے نہیں گزرتا عزت و احترام کے مقام رفیع کو حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ کہتے ہیں

شہپرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

انھوں نے مسلمانوں کو ترغیب دلائی کہ کرگس کی دون ہمتی چھوڑ دیں اور شاہین کی پرواز اپنے بال و پر میں پیدا کریں۔

پرواز ہے دونوں کی اسی دہر میں لیکن
شاہیں کا مقام اور ہے کرگس کا مقام اور

اقبال کے نزدیک علم و فراست اپنی تمام خوبیوں کے باوجود اس وقت تک بے قیمت ہیں جب تک ان کا حامل تیغ و شمشیر سے بھی آراستہ نہ ہو۔ ان کے نزدیک شاہین زندگی کی شرطِ اوّل مردِ غازی کی تیغ و شمشیر سے مؤانست ہے جو [illegible] میں کرے

من آں علم و فراست با پرِ کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی

اِقبال کی زِندگی

علامہ سر محمد اقبال ۱۸۷۳ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ سیالکوٹ ایک نہایت مردم خیز خطہ ہے۔ گزشتہ صدیوں میں بھی یہاں سے بعض ایسے صاحبِ کمال پیدا ہوئے جن کا نام تمام دنیائے اسلام میں آج تک بڑی عزت سے لیا جاتا ہے۔ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی جو شاہجہان کے زمانے میں تھے اور جن کو اُن کی شہرۂ تصنیف کے صلے میں چاندی میں تولا گیا تھا، یہیں کے رہنے والے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ سیالکوٹ کے مردم خیز ہونے کا ذکر علامہ اقبال سے کیا تو انھوں نے اس کی تصدیق کے لئے تاریخ میں سے ایسے کئی باکمالوں کے نام گنوائے جو اس سرزمین سے اُٹھے تھے۔ سیالکوٹ کا علاقہ کشمیر کی ریاست سے بالکل ملحق ہے اور بڑی کثرت سے کشمیری خاندان اس میں آباد ہیں۔ اقبال کے آبا و اجداد بھی کشمیر ہی سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے۔ ان کے اسلاف کشمیری پنڈت تھے جن کی ذات سپرو تھی۔ مجھے ان کے سپرو ہونے کا علم خود انہی کی زبانی حاصل ہوا۔ سر تیج بہادر سپرو اپنی علم دوستی کی وجہ سے اقبال کے بڑے قدردانوں میں ہیں، خود صاحبِ موصوف کی زبانی اس کا پتہ

بلکہ غالباً چار یا پانچ پشت اوپر اقبال اور میرے آباء ایک ہی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اس کے بعد ایک نے اسلام قبول کر لیا اور اختلافِ مذہب کی وجہ سے اس خاندان کی مختلف شاخیں ایک دوسرے سے بے تعلق ہو گئیں۔

اگرچہ اسلام کے زیرِ اثر اقبال ذات پات اور نسل پر افتخار کو صحیح نہیں سمجھتے تھے تاہم جابجا ان کے اشعار میں اس بات کے اشارے ملتے ہیں کہ ان کو اپنے برہمن زادہ ہونے پر بھی فخر تھا۔ برہمنوں کی ذہانت اور فلسفہ دانی سے کس کو انکار ہو سکتا ہے اور غالباً از روئے قانونِ توارث اقبال کو اس میں اچھا خاصہ حصہ ملا۔

اقبال کے والد گو صاحبِ ثروت نہ تھے لیکن اپنے شہر میں دل و دماغ کی پاکیزگی کی وجہ سے بہت قابلِ احترام سمجھے جاتے تھے۔ کوئی بیس برس کا عرصہ ہوتا ہے جبکہ اندر کلی والے مکان میں مجھے ان سے شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ اس وقت اقبال کی شہرت تمام ملک میں پھیل چکی تھی اور ان کے والد اقبال کے کمال پر بجا طور پر فخر کرتے تھے ان پر تصوف کا رنگ بہت غالب تھا۔ یہی رنگ اقبال میں علم و شعر کے جوہروں کے ساتھ مل کر اور بھی زیادہ گہرا ہو گیا اور اسی کی بدولت اقبال کو عطار، سنائی اور رومی کی صف میں جگہ ملی۔

اقبال کبھی کبھی اپنے والد کے کشف و کرامات بھی بیان کرتے تھے۔ فرماتے تھے "میں نے والد کی زبانی سنا ہے کہ ایک آدھ مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ والد کی موجودگی میں بے چراغ کمرے کے اندر تاریک رات میں عجیب و غریب قسم کا نور ظاہر ہوا اور تاریک کمرے میں ایسا معلوم ہوا کہ سورج نکل آیا ہے۔" اقبال کے والد کی گفتگو میں نہایت لطافت اور پاکیزگی پائی جاتی تھی۔

وہ ایک مرتبہ فرماتے تھے "اقبال کی پیدائش کے کچھ روز پہلے میں نے ایک خواب دیکھا کہ ایک بڑا ہی عجیب و غریب پرندہ فضا میں زمین کے قریب اُڑ رہا ہے اور بڑی کثرت سے لوگوں کا ہجوم ہے۔ اس ہجوم میں میں بھی ہوں وہ پرندہ کسی کی کوشش سے ہاتھ نہیں آتا لیکن خود بخود میرے دامن میں آگرا اور میں نے اسے پکڑ لیا۔"

فرماتے تھے "میں نے اس کی اقبال کی پیدائش کے بعد بھی تاویل کی کہ وہ پرندہ یہی بچہ ہے اور یہ ضرور کوئی غیر معمولی کمال پیدا کرے گا۔"

جس کسی کو ان سے ملنے کا موقع ملا ہو اس کو قطعاً اس بات میں شک نہیں ہو سکتا کہ اقبال کو اپنی طبیعت کے بہترین عناصر اپنے باپ ہی سے بچپن میں ملے۔ فارسی کی ایک نظم میں بھی اپنے والد کے اخلاق کا ذکر کرتے ہوئے یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ "میں نے ایک سائل کو بری طرح ڈانٹا والد سن رہے تھے انہوں نے اس درد انگیز طریقے سے میری اس درشتی پر سرزنش کی کہ اس کے بعد آج تک میں کبھی کسی سائل کے ساتھ کسی قسم کی سخت کلامی نہیں برت سکتا۔"

اقبال کو اپنی والدہ سے بھی بہت محبت تھی جس کا ثبوت اس بلیغ اور درد انگیز مرثیے سے ملتا ہے جو انہوں نے اپنی والدہ کی وفات پر لکھا ہے جس کا ایک بند یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ میرا انتظار ۔۔۔ کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بیقرار
خاکِ مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا ۔۔۔ اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا
تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا ۔۔۔ گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا
دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات ۔۔۔ تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات
عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی ۔۔۔ میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی

وہ جواں، قامت میں ہے جو صورتِ سروِ بلند / تیری خدمت سے ہوا جو مجھ سے بڑھ کر بہرہ مند
کاروبارِ زندگانی میں وہ ہم پہلو مرا / وہ محبت میں تری تصویر، وہ بازو مرا
تجھ کو مثلِ طفلکِ بے دست و پا روتا ہے وہ / صبر سے نا آشنا صبح و مسا روتا ہے وہ

تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی

اقبال کو جس زمانے میں اپنے اندر گہرے وجدانی رجحان کا احساس شروع ہوا تو ایک روز انہوں نے اپنے والد سے اس کا ذکر کیا "میں اپنے اندر کچھ ایسی چیزیں محسوس کرتا ہوں کہ اگر مجھ میں بعض جسمانی کمزوریاں نہ ہوتیں تو شاید میں بھی کسی فرقہ کا نبی ہو جاتا" اس پر ان کے والد نے تنبیہ کی "خدا کا شکر ہے کہ تم کو اپنی کمزوریوں کا علم ہے جو تم کو اس مغالطے میں پڑنے سے بچاتی رہیں گی۔"

میٹرک تک ان کی تعلیم سیالکوٹ میں ہوئی۔ خوش قسمتی سے اُردو فارسی اور اسلامیات کے ذوق کی تربیت کے لیے ان کو ایک ایسے استاد سے تلمذ حاصل ہوا جو اپنے زمانے کے بے نظیر شخص تھے۔ مولوی میر حسن بڑے عالم اور سخن فہم شخص تھے۔ اساتذہ کا کلام ان کو بڑی کثرت سے یاد تھا جو ذوقِ سخن ان کی طبیعت میں تھا اس کو وہ ہونہار شاگردوں میں بھی منتقل کر دیتے تھے۔ کچھ اپنے میلانِ فطرت کی وجہ سے اور کچھ مولوی میر حسن کے فیضِ صحبت کی وجہ سے جوانی کے زمانے میں اقبال کا یہی حال تھا کہ اساتذہ کے ہزارہا اشعار ان کو یاد تھے۔

سیالکوٹ کا اسکاچ مشن کالج تھا لیکن اس زمانے میں ایف۔ اے تک محدود تھا۔ اس لیے بی۔ اے کی تعلیم کے لیے اقبال لاہور چلے آئے اور

گورنمنٹ کالج میں داخل ہو گئے ۔ وہیں سے بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں بڑے امتیاز سے حاصل کیں ۔

اس زمانہ میں اقبال کی خوش قسمتی سے آرنلڈ وہاں فلسفے کے پروفیسر تھے ۔ آرنلڈ کو فلسفے کے علاوہ ادبیات کا بھی ذوق تھا اور اسلامیات سے بھی دلچسپی رکھتے تھے جس قدر اقبال آرنلڈ کے شاگرد ہونے پر خوش تھے آرنلڈ اقبال جیسے طباع اور ذہین شاگرد کی استادی پر فخر کرتے تھے ۔ آرنلڈ کا بیان تھا کہ ایسے طالب علم کے پڑھانے سے خود استاد کے علم میں اضافہ ہوتا ہے ۔

ایم اے میں فرسٹ آنے کے صلے میں اقبال کو ایک تمغہ بخشش ملا ۔ اس کے بعد وہ کچھ عرصہ اورینٹل کالج اور گورنمنٹ کالج میں فلسفے کے پروفیسر بھی رہے جب پروفیسر آرنلڈ ولایت جانے لگے تو اقبال کو اپنے ساتھ چلنے پر بہت مجبور کیا ۔

اقبال کی انگلستان کو روانگی

اقبال کے اس سفر یورپ میں ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے جو ابھی بقید حیات ہیں ان کی بڑی مدد کی شیخ صاحب کی آمدنی اگرچہ محدود تھی لیکن ان کو اپنے چھوٹے بھائی سے ایسا عشق تھا کہ انہوں نے اپنا تمام سرمایہ بے دریغ ان کے حوالے کر دیا ۔ اقبال بھی جب اپنے بھائی کا ذکر کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی معشوق کا ذکر کر رہے ہیں ۔ دونوں بھائیوں کا یہ گہرا عشق آخر عمر تک بدستور قائم رہا ۔

اقبال ۱۹۰۵ء میں عازم انگلستان ہوئے لیکن اس سے پہلے ہی وہ اپنی چند نظموں کی وجہ سے ایک اعلیٰ درجے کے شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے ۔ جو نظمیں انہوں نے انجمن حمایت الاسلام کے جلسوں میں پڑھیں

یاسر عبدالقادر کے "مخزن" میں شائع ہوئیں وہ ایسی بلند پایہ نظمیں تھیں کہ ہر سخن فہم کو احساس ہو گیا تھا کہ آسمانِ شعر پر ایک نیا آفتاب طلوع ہوا ہے۔

انگلستان میں وہ کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ زیادہ تر ان کا تعلق پروفیسر وارڈ اور سارلے سے ، یا پروفیسر براؤن سے۔ پروفیسر نکلسن سے کیمبرج میں میں نے دریافت کیا تھا کہ کیا طالب علمی کے زمانے میں وہ اقبال کو جانتے تھے؟ انھوں نے فرمایا "نہیں میں اس زمانے میں اُن سے واقف نہ تھا۔"

انگلستان کے دوران قیام میں مغربی فلسفے کے علاوہ اقبال نے اسلامی فلسفے کی طرف رجوع کیا اور بڑی تحقیق سے اسلامی تعلیمات کے فلسفہ کا مطالعہ کیا۔ اس تحقیق کا حاصل وہ مقالہ ہے جو "Metaphysics in Persia" کے نام سے شائع ہوا۔ اس مقالہ کی بناء پر میونخ یونیورسٹی سے اُن کو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری ملی۔ لندن میں انھوں نے بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔ اسی زمانے میں پروفیسر آرنلڈ کے قائم مقام کی حیثیت سے وہ کچھ عرصے لندن میں عربی کے پروفیسر بھی رہے۔ انگلستان کے زمانۂ قیام میں انھوں نے کچھ لیکچر اسلام پر بھی دیے۔

واپسی

۱۹۰۸ء میں وہ وطن واپس ہوئے۔ علمی شوق کی وجہ سے زیادہ موزوں بات تو یہی تھی کہ وہ پروفیسر ہوتے۔ لیکن کسی وجہ سے انھوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ ملازمت نہ کریں گے۔ اس زمانے میں انڈین ایجوکیشنل سروس میں پنجاب میں غالباً کوئی ہندوستانی نہیں تھا۔ یہ سروس زیادہ تر انگریزوں کے لئے مخصوص تھی۔ لیکن اقبال کے علم کا چرچا اس وقت بھی ایسا تھا کہ خود گورنمنٹ نے ان کے سامنے یہ خدمت پیش کی۔ لیکن اقبال نے اس کو قبول

کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کے دوستوں کو بڑا افسوس تھا کہ انھوں نے ایسا نادر موقع ہاتھ سے کیوں کھو دیا۔ جسٹس شاہ دین مرحوم اس زمانے میں ہائی کورٹ کے جج تھے۔ اس بارے میں وہ اقبال سے بہت ناراض تھے اور ان سے کہتے تھے تم جیسے آدمی کا عدالت میں کوئی کام نہیں۔ تحصیلِ علمی زندگی کو بطور پیشے کے اختیار کرنا چاہیے۔ میں نے ان سے ایک مرتبہ دریافت کیا کہ "آیا یہ بہتر نہیں تھا کہ آپ پروفیسر ہو جاتے؟" فرمانے لگے "میں نے کچھ دن پروفیسری کی اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہندوستانی کالجوں کی پروفیسری میں علمی کام تو ہوتا نہیں البتہ ملازمت کی ذلتیں ضرور سہنی پڑتی ہیں۔" فرماتے تھے "ایک مرتبہ طالب علموں کی حاضری کے متعلق گورنمنٹ کالج کے پرنسپل سے کچھ جھگڑا ہو گیا اور پرنسپل نے مجھ سے کچھ اس طرح گفتگو کی جیسے کوئی کلرک سے باتیں کرتا ہے۔ اس دن سے ملازمت سے طبیعت کچھ ایسی کھٹی ہوئی کہ جی میں ٹھان لی کہ جہاں تک ہو سکے گا ملازمت سے گریز کروں گا۔ اپنے اسی خیال کو انھوں نے اسرارِ خودی میں بیان کیا ہے۔

رزقِ خویش از دستِ دیگر العذر
الحذر از نانِ حیا گر الحذر

انگلستان کے دورانِ قیام میں قومی احیاء کے خیالات ان کی طبیعت میں موجزن ہونے لگے تھے۔ وہاں انھوں نے جو نظمیں لکھیں ان سے انھیں خیالات کا پتہ ملتا ہے۔

ہر شاعر جو دیگر کمالات کی بھی اہلیت رکھتا ہو کبھی کبھی شاعری کو لاطائل بھی سمجھنے لگتا ہے۔ اقبال کو انگلستان میں خیال ہوا کہ مسلمانوں میں شاعری انحطاط کے ساتھ وابستہ ہے اور اس قوم کو مزید شاعری کی ضرورت نہیں۔

چنانچہ انھوں نے ارادہ کیا کہ وہ شاعری چھوڑ دیں گے اور کوئی ایسا کام کیجیے جس سے قوم میں بیداری اور قوتِ عمل پیدا ہو۔ اس وقت تک ان کو اس کا پوری طرح احساس نہیں ہوا تھا کہ شاعری کا رُخ بدل کر بھی یہ کام بطریقِ احسن اس سے لیا جا سکتا ہے۔ اس زمانے میں سر عبد القادر بھی انگلستان ہی میں تھے اور دونوں ساتھ ہی رہتے تھے۔ سر عبد القادر کو اس کا خطرہ ہوا کہ کہیں سچ مچ اقبال شاعری ترک نہ کر دیں۔ اس معاملے میں دونوں میں بحث ہو گئی اور فیصلہ یہ ہوا کہ پروفیسر آرنلڈ سے مشورہ کیا جائے اور اس کے بعد قطعی فیصلہ کیا جائے۔ دنیائے ادب کے لیے یہ نہایت خوش قسمتی کی بات ہے کہ آرنلڈ نے ان کو نہایت صحیح مشورہ دیا اور ان سے کہا کہ بلند پایہ شاعری سے قوم کا ایسا فوری کام ہو سکتا ہے جو کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں۔ اس پر اقبال مجبور ہو گئے اور ان کا وہ خیال رفتہ رفتہ جاتا رہا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ ارادہ بھی کیا کہ شاعری کو محض تفننِ طبع کا ذریعہ نہ بنایا جائے بلکہ اس کی تمام قوت قوم کے اندر صحیح جذبات کے پیدا کرنے کے لیے صرف کی جائے۔

انگلستان سے واپسی پر اقبال بیرسٹری کے پیشے میں اپنے آپ کو استوار کرنے لگے۔ اگرچہ ان کو اپنی ذہانت، محنت اور شہرت کی وجہ سے کچھ نہ کچھ کام ملتا رہتا تھا، لیکن دیر تک ان کو یہ پتہ نہ چلا کہ ان کی بیرسٹری ان کی شاعری میں حائل ہے اور ان کی شاعری ان کی بیرسٹری میں مزاحم۔ عمر کا ایک نہایت ہی قیمتی حصہ انھوں نے اس پیشے پر ضائع کیا۔ میں نے ان سے ایک مرتبہ کہا "آپ نے یہ دو متضاد سے شغل کیوں اختیار کر رکھے ہیں؟" فرمانے لگے "اس تضاد سے بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ وکالت دنیا داری کا نچوڑ ہے۔ تمام جوڑ توڑ کے تمام فنون، اور خباثتوں سے انسان اس پیشے میں آشنا ہو جاتا ہے"

و طبیعت میں اس کے خلاف ایک ایسا ردِ عمل پیدا ہوتا ہے کہ بڑے زور سے انسان کی روح لطیف چیزوں کے حصول کے لیے بال و پر پھیلاتی ہے۔" اس پر انھوں نے یورپ کے بعض ایسے لوگوں کا ذکر کیا جو شاعر بھی ہیں اور بیرسٹر بھی۔ اقبال کے انتقال کے بعد مجھے اُن کا یہ فرمانا یاد آیا کیونکہ جس اخبار میں ان کی خبر انتقال درج تھی اس میں ساتھ ہی یہ خبر بھی تھی کہ اسی روز سر ہنری نیو بولٹ انگلستان کے مشہور شاعر بیرسٹر کا بھی انتقال ہو گیا۔ دونوں کی خبر وفات آپس میں ساتھ ہی ساتھ چھپی تھی۔

جتنی مدت اقبال بیرسٹری کرتے رہے علم علمی مشاغل ان سے نہیں چھوٹے وقتاً فوقتاً وہ شعر بھی کہتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس شغل کے لیے وہ اتنا ہی وقت دے سکتے تھے جتنا اپنے پیشے کے مشاغل سے بچ جاتا۔ مقتا نون کی کتاب وہ اہم مقدمے کی تیاری ہی کے وقت دیکھتے ہوں گے کیونکہ سینکڑوں دن ملاقاتوں میں میں نے ان کو اکثر فلسفے، ادب، تاریخ اور مذہب وغیرہ کی کتابیں پڑھتے ہوئے دیکھا لیکن کبھی قانون کی کتاب اُن کے ہاتھ میں نہیں دیکھی۔

بیرسٹری کے بہترین زمانہ میں بھی اُن کی آمدنی کبھی ایک ہزار روپیہ سے زیادہ نہیں ہوئی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے وقت ریاست کے بعض عہدہ داروں کا خیال ہوا کہ اقبال کو بطور پرنسپل کے یہاں بلایا جائے میں نے اُن سے اس کے متعلق دریافت کیا معلوم ہوا کہ وہ اس کے خواہشمند نہیں تھے۔ فرماتے تھے

"تنخواہ کے لحاظ سے تو مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور اگر تھوڑی سی رقم مجھے زائد مل جائے تو اس کے لیے جلا وطن ہونا کوئی معقول فعل نہیں۔"

اس زمانے میں وہ بڑی کثرت سے ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے

امتحانات میں ممتحن بنائے جاتے تھے۔ سیکڑوں جوابی بیاضوں کے پلندے ان کے پاس پڑے رہتے تھے۔ امتحانوں کے پرچے دیکھنے کا کام کچھ ایسا ہیکا تھی ہو جاتا ہے کہ وہ بیاضیں پڑھتے بھی جاتے تھے اور ہم نشینوں سے باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ پرچوں کو غور سے نہیں دیکھتے تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ذمے اول تو کوئی کام لینے سے بہت گریز کرتے تھے لیکن اگر کوئی کام اپنے ذمے لیتے تھے تو اس میں پوری کوشش صرف کرتے تھے۔

بیس برس سے زیادہ عرصے تک بیرسٹری اور شاعری کا ملا جلا شغل جاری رہا۔ اس زمانے میں عام قاعدہ تھا کہ ہر پیٹیا لیڈر بننے کی کوشش کرتا تھا جس کی طرف اکبر الٰہ آبادی نے ظریفانہ اشارہ کیا ہے۔

کوئل چھٹے ان کے پنجے سے جب تو پھر قوم مرحوم کے سر ہو ئے
پپیہے پکارا کئے "پی کہاں" مگر وہ لپٹ کر کے لیڈر ہوئے

اقبال کی سلامتی طبع کی یہ بہت بڑی دلیل ہے کہ وہ اس لائن میں نہیں آئے۔ ان کو ملک و قوم میں گھسیٹنے کی بہت کوششیں کی گئیں لیکن وہ اس سے گریز کرتے رہے۔ اس زمانے میں سیاست کا جو رنگ تھا اقبال کو اس میں خلاف سیاست کی بو آتی تھی اور وہ کہتے تھے "جب تک صورت حال یہی ہے تو لیڈر کسی قدر قوم فروشی ہی کے ساتھ پنپ سکتے ہیں" جس کے لئے وہ اپنی طبیعت کو آمادہ نہیں پاتے تھے۔ اس کیفیت پر انہوں نے وہ نظم لکھی ہے جس میں انہوں نے لیڈری کا نقشہ کھینچا ہے۔

میں نے اقبال سے از رہِ نصیحت یہ کہا عامل روزہ ہے تو اور نہ پابند نماز
تو بھی ہے شیوۂ اربابِ ریا میں کامل دل میں لندن کی ہوس لب پہ ترے ذکرِ حجاز

ختم تقریر تری مدحتِ سرکار پہ ہے
فکر روشن ہے ترا موجدِ آئینِ نیاز

اور لوگوں کی طرح تو بھی چھپا سکتا ہے
پردۂ خدمتِ دیں میں ہوسِ جاہ کا راز

اس پہ طرہ ہے کہ تو شعر بھی کہہ سکتا ہے
تیری مینائے سخن میں ہے شرابِ شیراز

جتنے اوصاف ہیں لیڈر کے وہ سب ہیں تجھ میں
تجھ کو لازم ہے کہ ہو اٹھ کے شریکِ تگ و تاز

غرض اس تمام نظم میں انھوں نے لیڈروں کے اخلاق کا خاکہ کھینچا ہے۔ آخر میں فرماتے ہیں کہ یہ سب کمال اور کمزوریاں مجھ میں بھی موجود ہیں، جب ہوں تو اچھا خاصا لیڈر ہو جاؤں۔ لیکن ایک بڑے ضروری عنصر کی کمی ہے۔ فرماتے ہیں:

سن کے کہنے لگا اقبال "بجا فرمایا"
شک مجھے آپ کی باتوں میں نہیں بندہ نواز

مجھ میں اوصاف ضروری تو ہیں موجود مگر
ہے کمی ایک کہوں تم سے جو ہو فاش نہ راز"

ڈھب مجھے قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی
اور پنجاب میں ملتا نہیں استاد کوئی

۱۹۲۶ء تک اسی خیال پر قائم رہنے کے بعد آخر سیاسی حالات کے انقلاب اور بعض احباب کی ترغیب نے ان کو اس میدان میں گھسیٹا۔ اس کے بعد وہ پنجاب کی اسلامی سیاست میں پیش پیش رہے۔ مسلم لیگ کے پریذیڈنٹ بھی ہوئے، مسلم کانفرنس کی رکنِ رواں بھی رہے اور پنجاب کونسل کے ممبر بھی ہوئے۔ میں نے ان سے ایک روز مذاق سے کہا کہ "کیوں جناب! آپ تو کونسلوں کو سرمایہ داروں کا اکھاڑا کہتے تھے اب خود اس میں کیسے شریک ہو گئے؟" فرمانے لگے "جو کہتا تھا وہ ٹھیک تھا۔ میں اس لئے شریک ہوا ہوں کہ اندر سے اس کی جانچ کی جائے۔"

کچھ سال کے تجربے کے بعد ان کو محسوس ہوا "میں عملی سیاست کا مردِ میدان نہیں بن سکتا مجھ کو اس سے علیحدہ کام کرنا چاہیے اور شعر کے ذریعے [illegible]

قوم کے ذہنوں میں تغیر پیدا کرنا چاہیے اور دوسری طرف لیڈروں کی طبیعتوں کی ایک خاص نصب العین کی طرف موڑنی چاہیے۔

اقبال زندگی کے کسی شعبے میں بھی عملی آدمی نہیں تھے۔ افکار و تاثرات نے ان کی تمام شخصیت پر قبضہ کر لیا تھا۔ مسلمانوں میں چونکہ قحط الرجال ہے اس لیے قوم ایک ہی انسان سے مختلف اور متضاد تقاضے کرتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ ایک شخص شاعر بھی ہو، مقرر بھی ہو، قومی لیڈر بھی ہو اور پیر و مرشد بھی ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ "ہر کسے را بہر کارے ساختند" ہر اہلِ کمال کسی خاص ہی صنعت میں کمال رکھتا ہے اور دوسری سمتوں میں اس کی استعداد اوسط سے بھی گر جاتی ہے۔ ایک زمانہ ایسا آیا کہ ہندوستان کے اکثر بڑے بڑے لیڈر اقبال کے اشعار سے اپنی تقریروں میں گرمی پیدا کرتے تھے اور اس کے اشعار کے پیدا کیے ہوئے جوش کو عمل میں تبدیل کرتے تھے۔ ان میں سے بعض لیڈر جو شاعر کی نفسیات سے واقف نہیں تھے، اقبال پر طعنہ زن ہوتے تھے کہ تم نے ہم کو مومن بنا دیا لیکن خود کافر کے کافر ہی رہے۔"

ایک مرتبہ مولانا محمد علی نے اقبال سے یہی کہا۔ اقبال نے جواب دیا۔ "لو بھائی تم نے دیکھا ہوگا کہ جب قوالی ہوتی ہے تو قوال بڑے مزے اور اطمینان سے گاتا ہے لیکن سننے والے ہو حق کرتے ہیں، وجد میں آتے ہیں، ناچتے ہیں، مضطرب ہوتے ہیں، بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر یہی کیفیتیں قوال پر بھی طاری ہوں تو قوالی ختم ہو جائے۔ میں تو قوم کا قوال ہوں، میں گاتا ہوں تم ناچتے ہو، کیا تم چاہتے ہو کہ میں بھی تمہارے ساتھ ناچنا شروع کر دوں؟" اس بیان میں اقبال نے ایک بڑے ظریفانہ انداز میں ایک بڑی حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ جس طرح فطرت میں تقسیمِ عمل ہے اسی طرح افراد میں بھی تقسیمِ عمل

ہونی چاہیے۔

<u>سیاست اور وطن پرستی</u> جہاں تک سیاسی افکار، تاثرات اور نصب العین کا تعلق ہے اقبال کی سیاست کے دو (۲) پہلو تھے۔ ایک طرف تو وہ تمام بلند پایہ مفکرین و مصلحین کی طرح تمام نوعِ انسانی کی بہتری کے متعلق سوچتا تھا۔ اس کی شاعری کا بیشتر حصہ انسانی زندگی کے نصب العین سے تعلق رکھتا ہے اور براہِ راست ملکی سیاست سے بے تعلق معلوم ہوتا ہے۔ بعض مخصوص گروہوں کے متعلق سوچنا عملی سیاستدانوں کا کام ہے۔ اعلیٰ درجے کے شاعر، حکیم یا نبی مخصوص گروہوں کو اپنی نظر کا مرکز نہیں بناتا۔ اقبال ہی کے مماثل جرمنی کا سب سے بڑا شاعر اور مفکر گوئٹے ہے جس کا زمانہ جرمنی کا وہ پرآشوب زمانہ تھا جس میں نپولین نے صرف جرمنی کو بلکہ تمام یورپ کو تہ و بالا کر رکھا تھا۔ گوئٹے اس تمام ہنگامے سے کچھ ایسا بے تعلق معلوم ہوتا تھا کہ بعض نقادوں نے اس کو متہم کیا ہے کہ اس میں جذبۂ حب الوطنی کی کمی تھی۔ اس قسم کی تنقید کوتاہ نظری ہی پر مبنی ہو سکتی ہے۔ وہی گوئٹے جس نے براہِ راست اس وقت کی عملی سیاست میں نہ قلم سے حصہ لیا اور نہ عمل سے اپنے افکار کی بدولت جرمنی کی علمی اور تہذیبی عظمت کا بانی ہے۔ اقبال کے متعلق بھی صورتِ حال اسی قسم کی ہے۔ اس نے شروع میں حبِ وطن کے عام جذبات کے ماتحت بڑی پرجوش نظمیں وطن پر لکھیں جن سے بہتر آج تک کوئی ہندوستانی شاعر نہیں لکھ سکا۔ لیکن اس دور کے بعد اس کی نظر وطن سے بے تعلق تو نہیں ہوئی لیکن وطن سے بلند ہو گئی اور وہ اس نقطۂ نظر پر آ گیا جو قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ کسی قوم میں تغیر حقیقی طور پر پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس قوم کے نفوس میں تغیر پیدا نہ ہو۔ سیاست دانوں کی نظر فقط ظاہر پر پڑتی ہے اور وہ فقط

عملی تعمیرات کی اُدھیڑبن میں لگا رہتا ہے لیکن حقیقی مُصلح کی نظر اساسیات پر رہتی ہے اور سیاست داں کے مقابلے میں بہت زیادہ وسیع اور دور رس ہوتی ہے۔ سیاست داں محض ابن الوقت ہوتا ہے اور معاملات کی گتھیاں جیسے جیسے پیدا ہوتی جاتی ہیں ان کو سلجھانے کے لئے وہ قاعدے اور قانون بناتا رہتا ہے جن کی تہ میں کوئی پائدار حقیقت نہیں ہوتی۔ اقبال کو یہ خیال ہوا کہ وطن سے متعلق کورانہ جوش کو ابھارنے کا وہی نتیجہ ہوگا جو مغرب نے جا بجا حب الوطنی سے پیدا کیا ہے۔ جغرافیائی حدود کی پرستش سے انسان کی نظر تنگ، اس کی عقل بہانہ جو اور اس کا دل حقیقی عشق سے محروم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا وہ اہلِ وطن کے دلوں میں ایسے جذبات پیدا کرنا چاہتا ہے جس میں محض یورپ کی حب الوطنی کی تقلید نہ ہو بلکہ عدل و انصاف کا راستہ بلا لحاظ حد و حدود سب کے لئے کھل جائے۔ وطن کی صحیح محبت اس کے دل میں آخر تک موجود تھی اور وہ اس کو ایک فطری جذبہ خیال کرتا تھا۔ آخر تک اپنی فارسی نظموں میں جہاں کہیں وہ ہندوستان کا ذکر کرتا ہے اس کے بیان میں بڑا درد اور سوز و گداز ہوتا ہے۔ وہ ہر قسم کی غلامی سے بیزار تھا اور وطن کو نہ صرف سیاسی بلکہ اقتصادی، عقلی، مذہبی اور اخلاقی غلامی سے بھی آزاد دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی سیاست کا دوسرا پہلو اس امر کے ساتھ وابستہ ہے کہ وہ صرف ہندی ہی نہیں بلکہ ہندی مسلمان تھا۔ اس نقطۂ نظر میں وہ تمام ہندی مسلمانوں کا نمائندہ تھا جہاں تک سیاست کا تعلق گروہوں کی اصلاح اور ارتقا سے ہے وہ جس طرح ہندوستان کی آزادی اور اس کے لئے اعلیٰ درجے کے اقتدار کا آرزومند تھا اسی طرح وہ تمام اسلامی دنیا کی آزادی اور اس کی ترقی کا متمنی تھا۔

ہندوستان کے بعض غیر مسلم حضرات مسلمان کی اس فطرت سے آشنا

نہیں دیا۔ چنانچہ جب کوئی مسلمان ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا سے متعلق دلچسپی یا جوش اور جذبے کا اظہار کرتا ہے تو وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ ہندوستان کو اپنا وطن نہیں سمجھتا اور وطن پرست یا قوم پرست نہیں ہے۔ ہر صحیح الفطرت مسلمان ہندوستان کی پستی سے اتنا ہی دل گیر ہے جتنا کہ اور کوئی غیر مسلم۔ ہندوستان کی عزت اس کی عزت اور ہندوستان کی ذلت اس کی ذلت ہے اس کا وجود خاکی اسی زمین سے ابھرا اور اسی میں پیوند ہو جائے گا لیکن اسلام نے اس کو ایک ایسی برادری کا بھی رکن بنا دیا ہے جو جغرافیائی حدود سے ماورٰی ہے۔ مراکش اور چین کے مسلمان کی سیاسی اور تمدنی کشمکش کے ساتھ بھی اس کے دل کو وہی رابطہ ہے جو خود اپنے وطن کی جدوجہد سے ہے۔

مسلمان کی وسعت قلب میں وطن کے لئے ایک نہایت عزیز مقام موجود ہے لیکن وطن سے ماورٰی دنیا کی عالمگیر اسلامی برادری کو بھی وہ اپنے دل سے الگ نہیں کر سکتا جب تک اسلام کے نصب العین میں کوئی قوت باقی ہے ہر سلیم القلب ہندی مسلمان کی طبیعت میں یہ دونوں جذبے بیک وقت موجود رہیں گے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں سے ایک جذبہ دوسرے کے منافی ہے۔ اب ہندوستان کے غیر مسلم وسیع النظر رہنما پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی سیاست میں یہی نقطۂ نظر اختیار کر لیا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے مسئلہ کو نہ کوئی ہندوستانی سمجھ سکتا ہے اور نہ کوئی صحیح راہ عمل پیش کر سکتا ہے جب تک کہ باقی اقوام کی سیاست کو بھی ساتھ ملا کر اس پر غور نہ کیا جائے۔ جس زمانے میں مسٹر گاندھی اور ان کے شرکائے کار نے خلافت کی تحریک میں عملی حصہ لیا باوجود اس امر کے کہ خلافت سے غیر مسلموں کو کوئی تعلق نہیں تھا۔ مسٹر گاندھی کی اس جدوجہد میں کسی کے دل میں یہ شک و شبہ پیدا نہیں ہوا

گاندھی جی ہندوستان کی سیاست سے دور ہٹ گئے ہیں۔ اس زمانے میں لالہ لاجپت رائے نے جو ہندوؤں کے نہ صرف سیاسی بلکہ مذہبی لیڈر بھی تھے ایک مضمون لکھا جس کا موضوع یہ تھا کہ ہندوستان کبھی آزاد نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اسلامی ممالک بھی آزاد نہ ہوں۔ ہندوستان کی آزادی اور غلامی، ان ممالک کی آزادی اور غلامی سے غیر منفک طور پر وابستہ ہے۔ یہی نقطۂ نظر لینن کا بھی تھا۔ حالانکہ وہ اپنی تحریک کو مذہب کے خلاف ایک جہاد سمجھتا تھا۔ محض اپنے سیاسی اور معاشی پروگرام کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لینن کا یہ خیال تھا کہ جب تک اسلامی ممالک آزاد نہ ہوں یورپ کی سرمایہ داری اور ملوکیت کو شکست نہیں ہو سکتی۔

ان حقائق سے آشنا ہونے کے بعد کوئی کج اندیش شخص ہی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ اقبال کا جذبہ جو اسلامی دُنیا کے متعلق تھا وہ اس کی حبِ وطن سے کوئی الگ چیز ہے۔ حریت کی ایک ہی پیکار کے یہ دو حربے تھے اور یہ دونوں حربے اقبال کی شاعری میں نمایاں اور ساتھ ساتھ موجود ہیں۔

جب وہ یہ کہتا ہے کہ انسان کو وطنیت سے پاک ہونا چاہیے اور اس کی گرد کو دامن سے جھٹک دینا چاہیے تو اس سے اس کی مراد فقط وہ غلط وطنیت کا جذبہ ہے جس نے مغربی اقوام کو اندھا کر دیا۔ وہ اس غلط وطنیت سے بچا کر اپنے ہم وطنوں کو وطنیت کے اس جذبے کی طرف لانا چاہتا تھا جو کسی خاص زمین کے ٹکڑے کی پرستش پر مبنی نہ ہو بلکہ عروجِ انسان اور اس کی روحانی ترقی کے ماتحت ہو۔ ہندوستان کے دوسرے مشہورِ عالم شاعر ٹیگور کا نقطۂ نظر بھی اقبال سے کچھ الگ نہیں ہے کون کہہ سکتا ہے کہ

ٹیگور میں جذبۂ وطنیت کی کمی ہے لیکن مغربی رنگ کی وطن پرستی کے خلاف ٹیگور نے بھی اپنی آواز بلند کی۔ ٹیگور نے دنیا کے ادب میں انسانی دلوں پر جو قبضہ کیا ہے وہ وطن کے متعلق رنگ کا گر نہیں کیا ہے بلکہ روحِ انسانی کی گہرائیوں میں ڈوب کر کیا ہے اور اپنے افکار اور تاثرات کی بدولت ان کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی جو ذات پات، نسل اور رنگ اور جغرافیائی حدود سے بلند ہے۔

اقبال ہندوستان کی آزادی اور عظمت کے طالب تھے اور ان مقاصد کے حصول کے لئے ان کی روح میں بڑی بے تابی تھی۔ لیکن ان کو یہ خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ آزادی محض آقاؤں کی تبدیلی نہ ہو اور تسلط کی قوت جو گوری قوم گوروں کے ہاتھوں سے نکل کر کالوں کے ہاتھوں میں نہ آجائے۔ یہی آزادی کے لئے وہ یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان میں ہر گروہ کو نہ صرف نصب العین طور پر مساوی حقوق حاصل رہیں بلکہ آئین و قوانین اس انداز کے وضع کئے جائیں کہ اس وقت تک رائج ہوں کہ وہ جس حیثیت سے پس ماندہ اور مظلوم ہیں ان کی پس ماندگی اور مظلومیت کا علاج کیا جائے۔

لیکن عام رہنما و قوم پرست فقط انگریزوں سے سیاسی قوت چھین لینے کے درپے ہیں۔ اور ان کے ضمیر میں وہ عدل پیدا نہیں ہوا جو تمام انسانوں کے لئے مساوی طور پر ترقی کی راہیں کھول دے۔ اقبال کے دل میں ہندوستان کے تمام مظلوم طبقوں کے لئے بڑا درد تھا اور اس معاملے میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تمیز ان کی نگاہ میں نہیں تھی۔ جب وہ مسلمانوں کے جائز حقوق کی حمایت کا ولولہ پیش میں کر رہے تھے تو اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی دوسری پس ماندہ اقوام کو بھی نظر میں رکھتے تھے۔ بے سرمایہ اور محروم مزدور، کسانوں کی حمایت میں جو کچھ انہوں نے لکھا اس میں ملت کی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی۔

اقبال بھی وطن کی آزادی کا ایک پُرجوش مجاہد تھا۔ لیکن مغربی انداز کی وطن پرستی کو بُت پرستی سمجھتا تھا۔ جہاں دوسرے قسم کے اصنام کو توڑنے کا کام اس نے اپنے ذمے لیا وہاں یہ بڑا بُت بھی اس کی ضرب و حرب سے نہیں بچ سکتا تھا۔

ڈاکٹر عاشق بٹالوی

علامہ اقبال کی خدمت میں چند لمحے

علامہ اقبال کی زندگی میں راقم الحروف کو عرصۂ دراز تک ان کی خدمت میں گاہے گاہے حاضر ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ جب مرحوم کا قیام میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں تھا اور صحت اچھی تھی تو تقریباً روزانہ شام کو دولت کدہ پر محفل جمتی تھی جس میں ہر مذاق کے لوگ شامل ہو کر کسب فیض کیا کرتے تھے۔ ان دلپذیر صحبتوں کے چند واقعات اب تک یاد رہ گئے ہیں۔

ڈگریوں کا اجراء

حضرت علامہ اقبال اگرچہ علم و فضل کے پیکر تھے لیکن یبوست یا خشکی جو بعض لوگوں کے نزدیک علم کا ضروری خاصہ ہے ان میں نام کو نہ تھی۔ طبیعت ہمیشہ شگفتہ اور مزاج ہر وقت بشاش و فرحاں رہتا تھا۔ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کا موقع ہوتا تو ایسی دلچسپ گفتگو کرتے کہ سننے والے گھنٹوں محظوظ ہوتے رہتے تھے۔ علامہ مغفور کو اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد سے بے حد محبت تھی۔ یہ محبت گویا عشق کے درجے تک پہنچی ہوئی تھی۔ شیخ صاحب جو عمر میں اگرچہ

سے پندرہ بیس سال بڑے تھے حال ہی میں اپنے وطن مالوف سیالکوٹ میں فوت ہوئے ہیں آپ دراصل متعدد نظموں بالخصوص "والدہ مرحومہ کی یاد میں" اور "التجائے مسافر" میں ڈاکٹر صاحب نے نہایت والہانہ انداز میں اس برادرانہ محبت کا اظہار کیا ہے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ "جب میں ولایت گیا تو کچھ اپنا روپیہ میرے پاس موجود تھا۔ لیکن زیادہ تر رقم میرے بھائی صاحب نے مجھ کو دی تھی۔ ولایت کے قیام کے دوران میں بھی وقتاً فوقتاً مجھ کو روپیہ بھیجتے رہتے تھے۔ جب میں نے کیمبرج سے بی اے کر لیا تو انھوں نے لکھا کہ اب بیرسٹری کا کورس پورا کر کے واپس آجاؤ۔ لیکن میرا ارادہ پی ایچ ڈی کی ڈگری لینے کا تھا۔ اس کے لیے جواب دیا کہ یہ رقم اور بھیجیے تاکہ جرمنی جا کر ڈاکٹری کی سند بھی لے لوں۔ چنانچہ مجھ کو مطلوبہ رقم بھیج دی۔ انھی دنوں میں وہ ایک روز سیالکوٹ میں اپنے دو مخلص دوستوں کی صحبت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی شخص نے پوچھا "کیوں شیخ صاحب سنا ہے اقبال نے ایک اور ڈگری لی ہے؟"

بھائی صاحب نے جواب دیا "بھئی کیا بتاؤں ابھی تو وہ ڈگریوں پہ ڈگریاں لیے جا رہا ہے۔ خدا جانے ان ڈگریوں کا انجام کب ہو گا؟"

ملتِ بیضا

ایک روز محفل جمی ہوئی تھی کہ ایک نوجوان نے جو کسی مقامی کالج میں ایم اے کا طالب علم تھا کہا "ڈاکٹر صاحب! آپ ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو ذات پات کی تمیز مٹا دینی چاہیے کیونکہ ہماری ذات صرف اسلام ہے؟"

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "بے شک میرا یہی عقیدہ ہے اور میں ہمیشہ اس کی تلقین کرتا ہوں۔"

نوجوان نے کہا "میں نے سنا ہے کہ خواجہ .... صاحب

کاٹھیاواڑ کے کسی خاندان میں شادی کرنا چاہتے تھے لیکن آپ نے انہیں منع کر دیا ہے اور کہا ہے کہ پنجاب کی کشمیری برادری سے باہر شادی نہ کریں۔"

ڈاکٹر صاحب بے اختیار ہنسنے لگے۔ "بالکل صحیح ہے۔ آپ جانتے ہیں خواجہ .... صاحب وہاں شادی کر لیں تو ان کی اولاد بھی کالی کلوٹی ہوگی اور اس طرح اس خاندان سے وہ صباحت رخصت ہو جائے گی جو کئی پشتوں سے اس کی خصوصیت چلی آرہی ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے بچے نہایت خوش رنگ اور سرخ و سپید ہوں تاکہ ہم لوگ صحیح معنوں میں ملتِ بیضا بن جائیں۔" اس لطیفے پر بے اختیار قہقہہ بلند ہوا اور دیر تک محفل میں خوش طبعی کی رو جاری رہی۔

پیارے صاحب رشید

ایک روز لکھنؤ اور دلی کی شاعری کا ذکر ہو رہا تھا۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ "اب دلی و لکھنؤ سے وہ لوگ رخصت ہوتے جا رہے ہیں جن کے دم سے اردو شاعری کے ان دو دبستانوں کی خصوصیات قائم تھیں اور چند سال کی بات ہے کہ لکھنؤ، دلی، لاہور، حیدرآباد سب ایک سطح پر آجائیں گے۔"

ڈاکٹر صاحب نے اس شخص کی طرف دیکھ کر کہا: "بے شک آپ صحیح کہتے ہیں۔ بہت سے لوگ تو رخصت ہو چکے اور جو باقی ہیں وہ بھی اٹھتے جا رہے ہیں۔ میں اپنا ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔

جب میں پہلے پہل لکھنؤ گیا تو وہاں کے مشہور شاعر پیارے صاحب رشید زندہ تھے۔ لکھنؤ کے بعض سخن فہم احباب نے میری آمد پر شعر و سخن کی ایک مجلس منعقد کی جس میں پیارے صاحب رشید بھی تشریف لائے۔ حاضرین سے میرا تعارف کرانے کے بعد میرِ مجلس نے فرمائش کی کہ میں اپنا کلام سناؤں۔ چنانچہ اُن کے

ارشاد کی تعمیل میں میں نے اپنی چند نظمیں سنائیں۔ مجھے وہ منظر اب تک نہیں بھولتا کہ میں اپنا کلام سنا رہا تھا اور میرے ہر شعر پر پیارے صاحب رشید کے چہرے سے حیرت و استعجاب و انقباض اور دل گرفتگی کے مخلوط جذبات کا اظہار ہو رہا تھا۔ کبھی ان کی بھویں تنتی اور ڈھیلی جاتی تھیں کبھی آنکھیں پھیل کر کھلتیں اور پھر بند ہو جاتی تھیں۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ جب میں کلام سنا چکا تو ان کے پاس بیٹھ کر ادب سے پوچھا کہ "آپ کے سامنے شعر پڑھنا بے تو گستاخی لیکن جو کچھ عرض کیا ہے آپ نے ملاحظہ فرمایا؟"

انھوں نے کسی قدر تامل سے جواب دیا۔ "ہاں صاحب سنا ہے۔ لیکن سچ پوچھیے تو ایسی اردو نہ ہم نے آج تک پڑھی ہے نہ سنی ہے۔ حیران ہوں کہ یہ فارسی ہے یا اردو ہے یا کوئی اور زبان ہے۔"

طوائف کا ماحول

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم بیان کرتے ہیں کہ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ کا ذکر ہے کہ پنجاب کے ایک مشہور رئیس نے جو سیاسی زندگی میں بھی کچھ نام پیدا کر چکے تھے لاہور کی ایک طوائف سے شادی کر لی۔ یاروں لوگوں میں اس واقعہ کا چرچا ہونے لگا۔ ایک روز ڈاکٹر صاحب کے سامنے بھی کسی نے ذکر چھیڑ دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس رئیس کا نام لے کر کہا کہ "میں ان کو خوب جانتا ہوں۔ وہ معقول شخص ہیں لیکن آرٹسٹ نہیں ہیں۔ اگر آرٹسٹ ہوتے تو طوائف سے کبھی شادی نہ کرتے۔"

حاضرین میں سے ایک صاحب نے جو غالباً شاعر بھی تھے کہا "کیا آرٹسٹ طوائف سے شادی کرنے کا مخالف ہے؟"

ڈاکٹر صاحب بولے "آپ خود آرٹسٹ ہیں۔ کیا آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ؟ ذرا غور کیجیے۔ باغ میں فرش زمرّدیں بچھا ہوا ہے۔ ہوا کے سرد جھونکے

طبیعت بشاش ہو رہی ہے۔ بلند بالا درختوں کی ٹہنیاں جھوم جھوم کر گلے مل رہی ہیں
کیاری کی روشوں پر دونوں طرف سرو ایستادہ ہیں۔ بیچوں بیچ نہر کا شفاف پانی بہہ
رہا ہے۔ پرندے چہچہا رہے ہیں۔ بھینی بھینی خوشبو سے فضا مہک رہی ہے۔
طرح طرح کے ہر رنگ کے پھولوں سے آنکھ کو نور، دل کو سرور حاصل ہو رہا ہے۔ کیا
ایسے ماحول میں ایک نازک سی شاخ پر کھلا ہوا گلاب کا پھول زیادہ خوب صورت
معلوم ہوتا ہے۔ یا اگر آپ اس کو توڑ کر اپنے گھر لے جائیں تو زیادہ خوشنما
معلوم ہوگا؟"

ایک مشنری کا قصہ

ایک روز پنڈتوں، مولویوں، واعظوں اور پیروں کا ذکر ہو رہا تھا کہ یہ لوگ کیا کیا بہروپ بھر کے اور کس کس طریقے سے سادہ لوح عوام کو ٹھگتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: "یہ بات صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ کم و بیش دنیا کے ہر ملک میں موجود ہے۔ میں جب کیمبرج میں پڑھتا تھا تو تعطیلات کے زمانے میں کچھ دنوں کے لئے اپنے ایک ہم جماعت انگریز دوست کے ہمراہ اس کے وطن چلا گیا۔ اس کا گھر انگلینڈ کے ایک دور افتادہ قصبہ میں تھا۔ مجھے وہاں گئے چند روز ہوئے تھے کہ معلوم ہوا کہ ایک مشنری جو ہندوستان سے آئے ہیں آج شام کو قصبے کے اسکول میں لیکچر دیں گے اور بتائیں گے کہ ہندوستان میں عیسائیت کو کس قدر فروغ ہو رہا ہے۔ میں اور میرے میزبان دونوں لیکچر سننے کے لئے پہنچے۔ سامعین میں عورتیں اور مرد کافی تعداد میں تھے۔ مشنری نے کہا کہ ہندوستان میں (۳۰) کروڑ انسان آباد ہیں۔ لیکن ان لوگوں کو انسان کہنا جائز نہیں۔ عادات و خصائل، بود و باش کے اعتبار سے یہ لوگ انسانوں سے بہت پست اور حیوانوں سے

کچھ اوپر ہیں۔ ہم نے سالہا سال کی جد و جہد سے ان حیوان نما انسانوں کو
تھوڑی بہت تہذیب سے آشنا کیا ہے۔ لیکن کام بہت وسیع اور اہم ہے
آپ ہمارے مشن کو دل کھول کر چندہ دیجیے تاکہ اس عظیم الشان مہم میں، جو
ہم نے بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے جاری کر رکھی ہے زیادہ سے زیادہ
کامیابی ہو۔ یہ کہہ کر مشنری نے میجک لینٹرن سے سامنے لٹکے ہوئے پردے
پر ہندوستانیوں کی تصویریں دکھانا شروع کیں۔ ان میں بھیل، گونڈ، دراوڑ
اور اڑیسے کے جنگلوں میں رہنے والی قوم کے نیم برہنہ افراد کی نہایت مکروہ و [illegible]
تھیں۔ جب لیکچر ختم ہو گیا تو میں نے کھڑے ہو کر صدر جلسہ سے کچھ کہنے کی اجازت
طلب کی۔ انہوں نے بخوشی اجازت دی تو میں نے بڑے جوش سے انگریزی میں
تقریر کی۔ میں نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا: میں خالص ہندوستانی ہوں
میرا خمیر اسی ملک کی سرزمین سے اٹھا ہے۔ آپ میری وضع قطع، رنگ روپ
چال ڈھال دیکھ لیجیے۔ میں آپ لوگوں کی زبان میں اسی روانی سے تقریر کر
ہوں جس روانی سے مشنری صاحب نے بزعم خود حقائق و معارف کے در
بہائے ہیں۔ میں نے ہندوستان ہی میں رہ کر تعلیم حاصل کی ہے۔ اب مز
تعلیم کے لیے کیمبرج میں آیا ہوں۔ آپ میری شکل و صورت دیکھ کر اور میری با
سن کر خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ مشنری صاحب نے ہندوستان کے باشندو
کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ کہاں تک درست ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستا
مشرقی دنیا کا ایک متمدن و مہذب ملک ہے جس نے صدیوں تک تہذ
اور علم کی مشعل بلند رکھی ہے۔ اگرچہ ہم سیاسی طور پر انگلستان کے غلا
ہو گئے ہیں لیکن ہمارا اپنا ادب ہے، اپنا تمدن ہے، اپنی قومی روایات
ہیں جو کسی طرح مغربی قوموں کی روایات سے کم شاندار نہیں ہیں۔ مشنری صا

محض آپ کے جذبات کو برانگیختہ کر کے آپ کی جیبیں خالی کرنے کے لئے
ندوستانیوں کی یہ گھناؤنی اور خوفناک تصویر پیش کی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کہتے تھے کہ جونہی میری تقریر ختم ہوئی جلسے کا رنگ بدل
گیا۔ سب لوگ میرے ہم خیال ہو گئے اور مشنری صاحب کو صد درجہ مایوسی
اور وہاں سے خالی ہاتھ نکلنا پڑا۔

مسٹر جناح

۱۹۳۶ء کے آخری ایام تھے اور نئے آئین کے ماتحت صوبجاتی
اسمبلیوں کے انتخابات کا زمانہ بالکل قریب آگیا تھا۔ ہندوستان
بھر میں اضطراب اور کشمکش کی ایک لہر جاری تھی اور ہر جگہ اسی بات کا چرچا
ہو رہا تھا۔ پنجاب میں اتحاد پارٹی اور مسلم لیگ کے درمیان زور آزمائی ہونے
والی تھی۔ ڈاکٹر صاحب لیگ کے حامی اور مسٹر جناح کے بہت بڑے
مداح تھے۔ ایک روز مسٹر جناح کی دیانت اور امانت اور قابلیت کا ذکر ہو رہا
تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا

”مسٹر جناح کو خدائے تعالیٰ نے ایک ایسی خوبی عطا
کی ہے جو آج ہندوستان کے کسی مسلمان میں مجھے نظر نہیں آتی۔“

حاضرین میں سے کسی نے پوچھا وہ خوبی کیا ہے تو آپ نے انگریزی
میں کہا۔

He is incorcuptible and unpurchasable-

جسمانی یا روحانی معراج

اسی محفل میں ایک شخص نے کہا ”لیکن ڈاکٹر صاحب!
مسٹر جناح تو شیعہ ہیں۔“

ڈاکٹر صاحب نے قدرے گرم ہو کر کہا ”آپ یہاں بھی شیعہ سنی
کا جھگڑا کھڑا کرنا چاہتے ہیں؟ جناح نے کب محدث و مفسر یا فقیہہ ہونے کا دعویٰ

کیا ہے؟ اس بیچارے نے کب کہا ہے کہ وہ عالمِ دین یا امامِ وقت ہے؟ اس نے کہاں لکھا ہے کہ مسلمان اس سے کتاب و سنت کا درس لیں؟ مسلمانوں کی بدبختی کی انتہا ہے کہ وہ ہر بات میں شیعہ سنی کی تمیز کھڑی کر دیتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ انگریز نے ہندوستان میں پارلیمنٹری طرزِ حکومت کے نام اپنی شہنشاہیت کو مضبوط کرنے کا ایک جال بچھایا ہے۔ جناح اس جال کی ایک ایک گرہ سے واقف ہے۔ وہ انگریزی سلطنت کی چالوں سے اس حد تک آگاہ ہے کہ خود انگریز بھی اس سے خائف ہیں۔

وہ بیچارہ صرف یہ کہتا ہے کہ مسلمان اس نظامِ حکومت کے ماتحت کہیں خسارہ نہ اٹھائیں۔ اس لیے وہ اپنی سیاسی بصیرت کی روشنی میں آپ کو ہوشیار ہو جانے کی تلقین کرتا ہے۔"

مجلس پر ایک خاموشی چھا گئی۔ چند منٹ کے بعد ڈاکٹر صاحب نے کہا، ایک اسی قسم کا واقعہ اور سنیئے۔

"جب میں ۱۹۲۶ء میں پنجاب کونسل کی ممبری کے لیے لاہور کے حلقۂ انتخاب سے کھڑا ہوا تو شہر کے بعض دوستوں نے چوک وزیر خان میں ایک جلسہ منعقد کیا اور بہت اصرار سے مجھ کو وہاں لے گئے۔ جلسے میں لوگوں نے مجھ سے تقریر کرنے کو کہا۔ میں نے مختصر سی تقریر کی اور بتایا کہ نظم و نسقِ حکومت میں قانون ساز مجالس کو کتنی اہمیت حاصل ہے۔ ان مجالس میں صرف ان لوگوں کو جانا چاہیے جو آئین و دستور کے ضابطے سے اچھی طرح واقف ہیں۔ میں ابھی تقریر کر ہی رہا تھا کہ ایک شخص نے کھڑے ہو کر سوال کیا۔ "یہ بتائیے کہ آپ آنحضرتؐ کی جسمانی معراج کے قائل ہیں یا روحانی معراج کے؟"

میں نے پوچھا اس سوال کا یہاں کیا موقع ہے؟"

اُس نے کہا "ہم نے سنا ہے آپ جسمانی معراج کے قائل نہیں ہیں۔ اگر صحیح ہے تو ہم آپ کو ووٹ نہیں دیں گے۔"

قندھار کا انار

۱۹۳۳ء میں نادر شاہ مرحوم بادشاہ افغانستان کی دعوت پر ڈاکٹر صاحب کابل تشریف لے گئے تھے۔ واپس آئے تو میں حاضرِ خدمت ہوا اور لوگ بھی بیٹھے تھے اور آپ سفر کے واقعات سنا رہے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ "آپ افغانستان سے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے کیا تحفہ لائے ہیں؟"

یہ سن کر آپ مسکرائے اور اپنے ملازم علی بخش کو آواز دے کر کہا ان کے لئے قندھار کا ایک انار لے آؤ۔ علی بخش نے ایک نہایت خوش رنگ اور بہت بڑا انار لا کر مجھے دے دیا۔ مرحوم نے میری طرف دیکھ کر فرمایا "یہ خاص قندھار کا انار ہے۔ میں کابل سے واپسی پر غزنی، قندھار اور کوئٹہ کے رستے سے آیا ہوں۔ یہ راستہ بہت لمبا ہے لیکن جن دلچسپیوں نے مجھے یہ طویل راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا ان میں ایک یہ بھی تھی کہ میں قندھار کے انار کھاؤں گا۔ جانتے ہو جب احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں مرہٹوں پر فتح حاصل کی اور سارا ہندوستان اس کے قدموں پر آ گرا تو کس چیز نے اس کو ہندوستان کی بادشاہی چھوڑ کر واپس افغانستان جانے پر مجبور کیا تھا؟ یہی انار۔ نواب نجیب الدولہ اور دوسرے مسلمان سرداروں نے اس سے درخواست کی کہ آپ یہیں رہ جائیے تو اس مردِ مجاہد نے جواب دیا کہ یہاں رہ جاؤں تو قندھار کے انار کیونکر کھاؤں گا؟"

غزنی

فرمایا کہ غزنی کی موجودہ آبادی سے ہٹ کر کچھ فاصلے پر جنگلوں کے

بے شمار مزار ہیں۔ ان مزاروں اور مقبروں کے چاروں طرف کھنڈر ہی کھنڈر ہیں۔ محمود غزنوی، سبکتگین کا مقبرہ ایک پہاڑی پر ہے میں وہاں نہ جا سکا۔ البتہ سلطان محمود اور حکیم سنائی کے مزاروں پر بیٹھ کر میں نے دیر تک قرآن کریم کی تلاوت کی ہے۔ ان مزاروں کی زیارت سے روح کو ایسی طمانیت اور بالیدگی نصیب ہوئی ہے کہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ بالخصوص حکیم سنائی کی قبر نے تو دل و دماغ کو انوار و تجلیات سے روشن کر دیا ہے۔ وہیں ایک شخص نے بتایا کہ قصبے کے اندر وہ مطب اب تک محفوظ ہے جہاں حکیم موصوف مطب کیا کرتے تھے۔ میری طبیعت کو یہ جگہ دیکھے بغیر کیونکر قرار آ سکتا تھا۔ چنانچہ اسی روز اس شخص کی رہنمائی میں میں وہاں پہنچا۔ غزنی کے بازار یوں بھی بہت تنگ ہیں لیکن جس گلی میں حکیم سنائی کا مطب تھا وہ تو غیر معمولی طور پر تنگ ہے۔ مطب کی یہ جگہ مٹی کے ایک کچے چبوترے کی صورت میں ہے جس کا بمشکل دو گز طول اور دو گز عرض ہوگا محفوظ ہے۔ لوگ ادب سے اس کو ہر روز صاف کر دیتے ہیں۔ میں دیر تک عالم محویت میں اس چبوترے پر بیٹھا رہا اور طبیعت نے سوز و گداز کی وہ نعمت پائی کہ اس کا اظہار لفظوں میں نہیں ہو سکتا۔"

از
حامد علی خاں

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
پنچکوئیاں روڈ نئی دہلی ۱

سر اقبال دے نال میل

”پیر خانے“ دے اندر

علامہ اقبال علیہ الرحمۃ سے ملاقات کی یہ دلچسپ تفصیل پنجابی رسالہ ”سارنگ“ بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۰ء میں چھپی تھی۔ جس رسالے کے ایڈیٹر ایک ہندو نوجوان مسٹر ایس۔ ایل۔ پراشر تھے علامہ اقبال سے یہ ملاقات غالباً مسٹر ایس۔ ایل۔ پراشر نے خود کی تھی۔ میں نے اس مقالے کا لفظی ترجمہ کیا ہے اور حتی الامکان کوشش کی ہے کہ اصل پنجابی انداز بیان بھی حد تک قائم رہے۔

آج ڈاکٹر سر اقبال کا نام دنیا میں بڑے فخر سے لیا جاتا ہے۔ سارے ہندوستان کو اس کی ذات پر ناز ہے۔ واقعی اقبال نے پنجاب کو سر اونچا کرنے کے قابل بنا دیا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کو بہت کم یہ خیال آتا ہے کہ اقبال پنجاب کا رہنے والا اور پورا پکا پنجابی ہے اس کی وجہ شاید

9827

یہ ہے کہ اقبال کی ساری شاعری اُردو یا فارسی زبان میں ہے اور اس میں پنجاب کی زندگی یا پنجاب کی خوب صورتی کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کی شاعری کا پیغام کسی خاص ملک کے لوگوں کے لیے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لیے ہے۔ ان کی نظموں کے پرندوں، شمع، جگنو، پرندوں، جانوروں، گھاس، بوٹیوں، مچھروں اور پودوں کی بھی کوئی اصلیت نہیں ہوتی یہ سب خیال کی تخلیق ہیں۔ تخیل ہی انھیں پیدا کرتا ہے، تخیل ہی مارتا ہے اور تخیل ہی جِلا اٹھاتا ہے۔ اقبال اپنے تخیل کی دنیا میں خیالوں کی آمد و رفت کا تماشا دیکھنے میں مست ہو چکا ہے۔

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندِ دگر

خیالوں کا کھیل اقبال کے لیے شطرنج کی بازی سے بھی زیادہ پُرلطف ہے، وہ شاہ کو مات کرنے کی دُھن میں لگا ہوا ہے۔ کسی وقت دم بھر کے لیے وہ حقّے کا ایک آدھ کش لگاتا ہے اور پھر اپنی بازی میں محو ہو جاتا ہے اسے کسی دوسری بات کی سُدھ بُدھ نہیں۔ کوٹھی[۱] کا احاطہ ویران سا پڑا ہے۔ گرد اور خاک دھول کی کثرت سے جگہ اُجڑی اُجڑی سی لگتی ہے۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی بیریوں کی ایک قطار کسی خانقاہ کے مجاوروں کے حجرے کی راہ دکھاتی ہے۔ صفائیوں کا کس کو دھیان ہے؟ کون یہاں مشاقی سے گھاس پھول اُگایا کرے؟ باہر کے حال کی کسی کو خبر بھی ہو؟

ہمیں یاد ہے جب ہم اقبال صاحب سے ملنے گئے تو وہ بیٹھک میں ایک آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سخت کالر لگا رکھا تھا اور پرانے زمانے کے

---

[۱] یہ جاوید منزل سے پہلی کوٹھی کا ذکر ہے۔

کالا انگریزی سوٹ پہنے حقّہ پی رہے تھے۔ شکل و صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی یونیورسٹی کے فلسفے کے استاد ہیں۔ پل بھر کے لیے ہم نے سامنے بیٹھے ہوئے وکٹوریئن سے آنکھ بچا کر کمرے کی چیزوں پر ایک نظر ڈالی۔ ہمارے سامنے ہی انگیٹھی پر ملکہ وکٹوریہ کی تصویر پڑی تھی۔ ہم سے مسکرائے بغیر نہ رہا گیا۔ اور ہم نے ان سے پوچھا "اس تصویر سے کوئی خاص پیار ہے؟ یا کسی خاص مطلب سے یہاں رکھی گئی ہے؟"

انھوں نے جواب دیا "یہ تصویر ایک دفعہ میرا بھائی کہیں سے لے آیا تھا۔ اس نے یہاں رکھ دی تھی اور یہ یہاں پڑی ہے۔ میں نے تو کبھی خیال ہی نہیں کیا کہ یہ بھی یا نہیں!" یہ اقبال کا حال ہے۔ وہ اپنی دنیا میں مست ہے۔ اسے باہر کی چیزوں کے دیکھنے بھالنے کی فرصت ہی نہیں۔

انھوں نے ہوتے ہیں بائیں ہاتھ کی دیوار پر دو میموں کی تصویروں کی طرف توجہ دلائی اور ہنس کر ایک مولوی صاحب کی بات سنائی

"ایک دفعہ ایک مولوی میرے پاس آیا ہوا تھا۔ نماز کا وقت ہوا تو وہ اس کمرے میں نماز پڑھنی شروع کرنے لگا۔ لیکن ان تصویروں کو اپنے سامنے دیکھ کر رک گیا اور بولا "یہ تصویریں یہاں سے ہٹوا دیجیے۔"

میں نے کہا آپ ان تصویروں کی طرف دھیان ہی نہ کیجیے۔ یہ اس جگہ دیوار کا عیب چھپانے کے لیے لگائی گئی ہیں۔ لیکن مولوی نہ مانا۔"

ہم نے اقبال صاحب سے پوچھا "آپ کا پنجابی بولی کے متعلق کیا خیال ہے؟" ان کا جواب یہ تھا کہ "پنجابی بولی اس وقت علمی زبان نہیں

لے وکٹوریہ کے زمانہ کا آدمی۔ اس عہد کے فیشن کا آدمی۔

اس میں نثر بہت کم ہے۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ نثر کے لکھے جانے سے یہ علمی زبان نہ بن سکے۔ پنجابی میں "رچنے پچنے"؎ بہت ہے لیکن اس کی وجہ یہ رہی ہے کہ عام طور پر کم پڑھے لکھے آدمی ہی اسے پڑھتے لکھتے رہے ہیں۔ پڑھے لکھے آدمیوں کی ہمت سے اس میں لطافت اور نزاکت پیدا کی جا سکتی ہے۔ پنجابی میں "بحر" from پر بہت کم زور دیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بحروں کا لحاظ قائم نہیں رہتا۔ بہاولپور کے احمد یار نے تھوڑی بہت ہمت کی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ مجھ سے پہلے کسی نے بحر، قافیے اور ردیف کا اتنا خیال نہیں رکھا۔ پنجابی شاعری بڑی بڑھیا شاعری ہے اور خاص طور پر جذبات سے بھیگی ہوئی ہے۔ پنجابی شاعری کی زبان بڑی سیدھی سادھی نرم اور میٹھی ہوتی ہے جذبات سچے ہوتے ہیں اور بڑے کھلے الفاظ میں بیان کیے جاتے ہیں۔ لیکن تشبیہوں میں بعض اوقات مذاق پست ہو جاتا ہے۔

ایک شعر میں محبت کو بیان کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے ؎

تے جنہری جھک جہاں تے آئی کوئی آب حیات تے پیتو
یا وت پت علیب حُسن دی پئی کرا وتیوں نے نوں

(علی حیدر)

عشق کے رموز پنجابی میں خوب بیان کیے جا سکتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ پنجابی شاعری میں صرف مجازی عشق ہی ہوتا ہے، نہیں بلکہ عشق حقیقی زیادہ ہوتا ہے۔ پنجابی شاعری تصوف سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات یوں معلوم ہوتا ہے کہ پنجابی شاعری میں تصوف

؎ گنوار پن۔

کے سوا اور کچھ بوجھ نہیں سکتا۔ پنجابی شاعری میں ایک اور خصوصیت ہے۔ اس میں وطن کی محبت سے متعلق بڑے پرجوش گیت ملتے ہیں۔ فوجی گیتوں کی بھی کمی نہیں عام لوگوں کے گیتوں اور "بولیوں" کی تو حد ہی نہیں۔ اُردو میں تصوّف کی شاعری ہے ہی نہیں۔ صرف ایک میر دردؔ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اُردو میں وطن کی محبت کی شاعری اور فوجی گیت بھی نہیں ہیں۔ اُس کی عشقیہ شاعری میں بناوٹ زیادہ اور جذبات کا زور کم ہے۔ عام لوگوں کے گیت تو اس میں بالکل نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو شاعری درباروں اور امیروں اور صاحبوں کے ہاتھوں میں پھلی پھولی ہے۔ وہ لوگ یا تو ایرانی تھے یا ایرانی مذاق کو پسند کرتے تھے۔ اُن کا میل جول عام لوگوں سے نہیں تھا۔ اسی وجہ سے اُردو شاعری میں امیرانہ رنگت آگئی تھی۔ وہ شعر کہنے کو ایک فیشن سمجھتے تھے۔ شعر گوئی پر قدرت حاصل کرنا ہی شاعر کی خوبی سمجھی جاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض اوقات صرف بحر نبھانے اور ردیف کی خاطر بناوٹی جذبے اور بناوٹی خیال گھڑنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ لیکن پنجابی کے لئے اُردو کی خوبیوں کی ضرورت ہے۔ پنجابی شاعروں کو اُردو شاعروں کی طرح "بحر" پر قدرت حاصل کرنی چاہیے اور اُردو شاعری کی قوت اور پاکیزگی پنجابی شاعری میں پیدا کرنی چاہیے۔"

ہم اقبال صاحب کے بڑے گہرے یار محمد حسین صاحب سے سُن چکے تھے کہ اقبال صاحب پنجابی شعر پڑھنے سُننے کے بڑے شوقین ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ غلام قادر کی "چٹھیاں" سُنتے ہوئے وہ رو پڑے تھے۔ پھر بھی ہم پنجابی

لے خیالات و الفاظ کی تراش خراش اور بناوٹ۔

لے پنجابی گیتوں کی ایک قسم جس میں محبوب کے نام خط لکھا جاتا ہے۔

شاعری کی حقیقت سے اُن کی یہ واقفیت دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ انھوں نے اُردو شاعری سے مقابلہ کر کے دونوں زبانوں کی شاعری کے مذاق کا خلاصہ بیان کر دیا تھا۔ پنجابی شاعری کی بنیاد عام لوگوں کی زندگی پر ہے اور اردو شاعری کی بنیاد امیروں اور مصاحبوں کی زندگی پر ہے۔

اس موقع پر ہمیں بہت افسوس آیا کہ پنجابی کی بہت سی کتابیں گورمکھی حروف میں ہیں جس کے باعث لوگوں کو پنجابی کے علمی خزانوں کا حال معلوم نہیں۔ پنجابی بولی کے متعلق اقبال صاحب کے خیالات سن کر ہماری ہمت بندھی اور ہم نے پوچھا کہ "کیا آپ کے لئے زبان کا سوال پیدا نہیں ہوا تھا؟ آپ کو پنجابی زبان میں لکھنے کا خیال کبھی نہیں آیا تھا؟"

اقبال صاحب نے جواب دیا "نہیں میری تعلیم ہی کچھ ایسی ہوئی تھی کہ مجھے کبھی پنجابی لکھنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ اور نہ میں اب لکھ سکتا ہوں۔"

ہم نے پوچھا "فارسی میں لکھنے کا خیال آپ کو کس طرح آیا؟"

انھوں نے جواب دیا "میں نے دیکھا تھا کہ فارسی میں میرے خیالات اچھی طرح ادا ہو سکتے ہیں۔ دوسرے فارسی دنیا کے بہت سے حصوں میں سمجھی جاتی ہے۔"

ہم نے کہا "ہمیں تو بڑا افسوس ہے کہ آپ کے سے جاننے والے ہوتے ہوئے پنجابی نے اپنی زبان میں نہیں لکھا۔ پنجابی کو تو آپ جیسے آدمی کی ضرورت تھی۔ جس طرح گوئٹے نے اپنے وقت کی بے حقیقت جرمن بولی کو دنیا کی ایک عظیم الشان زبان بنا دیا تھا، اسی طرح آپ بھی پنجابی زبان کو ترقی دے سکتے تھے۔"

سر اقبال نے کہا "کوئی بولی بھی ہو ایک زبردست شخصیت اُسے بنا سکتی

اور کوئی تعجب کی بات نہیں کہ غیب ہی کو بھی کوئی گونگے جیسا آدمی مل جائے۔"

ہم سے یہ پوچھے بغیر نہ رہا گیا کہ کیا آپ نے یہ محسوس نہیں کیا تھا کہ اپنی شخصیت کا پورا اظہار اپنی زبان کے سوا اور کسی زبان میں نہیں ہو سکتا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا "میں نہیں مان سکتا کہ اپنی زبان کے سوا آدمی اور کسی زبان میں اپنا مطلب پوری طرح بیان نہیں کر سکتا۔ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ زبان کا سوال اتنا اہم نہیں ہوتا۔ خواہ کوئی زبان ہو، صرف عشق ہونی چاہیے۔ ہر ایک زبان میں سمجھا جا سکتا ہے۔ اصل چیز تو خیال ہے۔"

ہم اقبال صاحب کے اس جواب پر حیران ہوئے کہ ایک شاعر کا یہ خیال ہے کہ آدمی اپنی نیچ کی زندگی کا "اظہار" پرائی بولی میں کر سکتا ہے۔ مگر ہم سمجھ گئے کہ انہوں نے صرف اپنی شاعری کو پیش نظر رکھا ہے جس میں زیادہ تر تخیل کا آتا جاتا دکھایا گیا ہے۔

ہم نے پھر کہا "معاف کیجیے آپ کا عقیدہ کہ زبان کا سوال اتنا اہم نہیں ہوتا ایک ناول یا ڈرامہ لکھنے والے کے لیے کس طرح درست ہو سکتا ہے جبکہ ناول یا ڈرامہ لکھنے والے کو ہر حال لوگوں کی زندگی سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس کے لیے لوگوں کی زبان استعمال کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "ہاں ناول یا ڈرامہ لکھنے کے لیے لوگوں کی زبان استعمال کرنی پڑتی ہے۔ اگر کوئی شخص پنجابی ناول یا ڈرامے لکھنا چاہے تو کیا حرج ہے۔ اردو پنجابی میں لکھے۔"

ہم نے کہا "کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر رچرڈز کا خیال ہے کہ ایک جرمن آدمی دوسرے ملک کی شاعری سے پوری طرح لطف نہیں اٹھا سکتا۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

اقبال صاحب نے جواب میں ان کی صفائی پیش کر دی۔ انھوں نے کہا "میں ایسی شاعری کو شاعری نہیں سمجھتا۔ اصل شاعری روح کی شاعری ہوتی ہے اور وہ ساری دنیا کے لئے ہوتی ہے۔" گفتگو ختم ہونے کے لئے اقبال صاحب نے قرآن کی ایک آیت پڑھی جس کا مطلب بابا آمٹے کے الفاظ میں یہ ہوتا ہے کہ مل جل کے جینا سیکھنا چاہئے۔

یَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ۔ (قرآنِ مجید)

مطلب یہ ہے کہ ہم سب خدا کو جانتے ہیں ہمیں مل جل کر رہنا چاہیے اور مشترک اصولوں پر ہمیں متحد ہو جانا چاہیے۔

ہم نے کہا "تو پھر آپ کی شاعری میں مسلمانوں سے خطاب، ایسے ہی مسلمانوں کے لئے ہوتا ہے؟"

اُن کا جواب تھا "ہاں آپ نے ٹھیک بوجھ لیا ہے۔"

پروفیسر خواجہ عبدالحمید
لیکچرار گورنمنٹ کالج ملتان

اقبال کے علمی جواہر پارے

ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال علیہ الرحمتہ سے پہلی بار ملاقات کا شرف مجھے نومبر ۱۹۲۰ء میں حاصل ہوا۔ اس سے پہلے میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں بیسیوں بار ان کو دور سے دیکھ چکا تھا۔ اسلامیہ اسکول لاہور کی طالب علمی کے زمانے میں جب کبھی انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسے میں ڈاکٹر صاحب تشریف لاتے تو ہر شخص کی زبان پہ ہوتا "آج ڈاکٹر اقبال نے آنا ہے" ہر کس و ناکس وہاں موجود ہوتا۔ آپ بالعموم گلے سے اپنی نظم پڑھا کرتے تھے۔ پہلی نظم جو میں نے ان کی زبان سے بغیر ترنم کے سنی "شکوہ" تھی۔ اس کے بعد "شمع و شاعر" ۱۹۱۲ء "جواب شکوہ" (جو موچی دروازہ کے باغ میں پڑھی گئی) پھر دوبارہ ترنم "خضر راہ" سے شروع ہوا جو اسلامیہ اسکول اندرون شیرانوالہ کے صحن میں پڑھی گئی تھی ان دنوں ڈاکٹر صاحب کی طبیعت قدرے علیل تھی اس لئے نظم مذکورہ

گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ کر پڑھی تھی۔

اس زمانہ سے پہلے مجھ جیسے شخص کے لیے تو ڈاکٹر صاحب کا نام، ان کی شکل و صورت اور ان کا ترنم ہی باعث کشش ہوتا تھا۔ اسکول اور کالج کے زمانہ میں ہر مسلمان طالب علم کو ڈاکٹر صاحب کے کچھ نہ کچھ اشعار، اور لاہور میں تو ہر مذہب کے طلبہ کو یاد ہوتے تھے اور مجلسیں ان اشعار کے ترنم سے گرمائی جاتی تھیں۔ کالج کے زمانہ میں ڈاکٹر صاحب کو ہر روز شیرانوالہ کے دروازے سے باہر والی سڑک پر اپنی مختصر سی گاڑی (ٹانگہ) میں چیف کورٹ سے واپس آتے دیکھتا تھا۔ چہرہ سرخ، سنہری مونچھیں، سرخ ترکی ٹوپی اور سیاہ سوٹ، ہاتھوں میں گھوڑے کی باگ۔ غرض اسی شان سے ہر روز تفریح کی گھنٹی میں مجھے دور سے ان کی زیارت نصیب ہوتی تھی۔ لاہور میں ہم لوگوں میں "ڈاکٹر صاحب" کا لقب "حضرت اقبال" ہی کے لئے وقف تھا۔ اس لئے آئندہ سطور میں میں اسی لقب سے یاد کروں گا۔

نومبر ۱۹۲۰ء میں ہندوستان بھر میں تحریک عدم تعاون زوروں پر تھی، لاہور میں کانگریس کے کارکنوں کی خاص توجہ اسلامیہ کالج کی طرف مبذول تھی۔ مسلمان اور ہندو اکابر لاہور میں جمع تھے اور ان کی ہدایات کے مطابق کانگریسی کارکنوں کے اسلامیہ کالج میں جماعتوں کا کام تقریباً ناممکن بنا دیا تھا خود اسلامیہ کالج کی ہستی معرض خطر میں تھی۔ ڈاکٹر صاحب ان دنوں

انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے جنرل سکریٹری تھے۔ چنانچہ ایک روز کالج کے چند پروفیسروں نے (جن میں راقم الحروف بھی شامل تھا) فیصلہ کیا کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں چل کر ان متضاد فتووں اور قراردادوں کے متعلق، جن کی بارش ہر سمت سے کالج پر ہو رہی تھی، ان کی رائے دریافت کی جائے۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت انارکلی والے مکان میں مقیم تھے اور حسب عادت آرام کرسی پر بیٹھے تھے۔ حقہ پاس تھا (میں نے انھیں اُن کی قیام گاہ میں حقے کے بغیر کبھی نہیں دیکھا)۔ ڈیڑھ دو گھنٹوں تک تحریکِ عدم تعاون کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو ہوتی رہی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ابھی انھوں نے اس تحریک کی ضرورت اور صحت کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی۔ گاندھی جی کی انھوں نے بہت تعریف کی اور جو کام وہ ہندو قوم کی بہتری کے لئے کر رہے تھے، اسے مدِ نظر رکھتے ہوئے فرمانے لگے کہ کوئی تعجب نہ ہوگا، اگر ہندوؤں کی آئندہ نسلیں انھیں اوتار تسلیم کرلیں۔ ہم لوگوں نے دریافت کیا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ ظریفانہ انداز میں فرمایا "جس قدر کام کالج میں ہو سکتا ہے کرتے جاؤ۔ ہاں ابھی یہ ڈر ہے کہ کالج ٹوٹ نہ جائے اور آپ لوگوں کو تلاشِ روزگار کی زحمت اٹھانی پڑے۔ سو میرا مشورہ یہ ہے کہ ایک وقت کا کھانا کاٹ دو۔ میں نے بھی یہ کام شروع کیا ہے اور میری صحت پر اس کا اثر بہت اچھا پڑا ہے۔" اس پر قہقہہ پڑا اور ہم لوگ واپس آ گئے۔

اس کے بعد مجھے گاہے گاہے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملتا رہا، اور ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء تک تو شاید کوئی ہفتہ ایسا نہ تھا جس میں انکی خدمت میں ایک یا دو بار حاضری کا اتفاق نہ ہوا ہو۔ ان صحبتوں میں طرح طرح کی باتیں ہوتی تھیں۔ اگر کوئی اور صاحب موجود نہ ہوتے تو میں ان سے بعض باتوں اور مسائل کے متعلق سوالات کرتا جن کا وہ کمال مہربانی سے شافی جواب مرحمت فرماتے۔

میرے ذمے ایک فرض یہ تھا کہ فلسفہ اور جنرل سائنس کے متعلق جو بھی اور تازہ چھپی ہوئی کتاب نظر سے گزرے اسے ان کی خدمت میں پیش کروں اور پیش کرنے سے پہلے پڑھ لوں چنانچہ کتاب لیتے وقت وہ مجھ سے اس کے متعلق رائے پوچھتے ہوئے اچھا خاصہ امتحان لے لیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی زبان فیض ترجمان سے جو ہزارہا جواہر ریزے بکھرتے رہے ہیں، ان میں سے چند کو جو مجھے یاد ہیں اور جن میں کوئی ایسی بات نہیں جو کسی کے لئے بار خاطر ہو، میں نے یہاں جمع کیا ہے۔ ان میں ان باتوں کو درج نہیں کیا ہے جن میں ملی یا سیاسی معاملات پر تفصیلی بحث تھی یا جن میں فلسفہ یا سائنس کے دقیق مسائل پر بحث تھی۔ ایسی باتوں کو بھی ترک کر دیا گیا ہے جن کا تعلق ذاتیات سے ہے۔ ایسی باتیں بھی نہایت پر لطف اور سبق آموز ہوتی تھیں، لیکن ان کا شائع کرنا مناسب نہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی یاد ان کے عقیدت مندوں کے دلوں
میں ابھی تازہ ہے، وقت گزرتا جائے گا اور ان کی شخصیت کے
خط و خال ذہن میں دھندلے پڑتے جائیں گے۔ اس وقت ہر
اس شخص کے پاس جو ان کی خدمت میں حاضر ہوا (اور ایسے اشخاص
کی تعداد ہزارہا ہے) ان کا کوئی نہ کوئی ذہنی تبرک ضرور موجود
ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ ان تبرکات کو جمع کر دیا جائے
افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو زندگی میں کوئی بوسول Bosevall
نہ ملا، اس لئے درخواست ہے کہ جن بزرگوں اور دوستوں کو ان
سے ملنے کا اکثر اتفاق ہوا ہو وہ ان کے جواہر ریزوں کو ضائع ہونے
نہ دیں اور جلد از جلد دنیا کے سامنے پیش کریں۔ ڈاکٹر صاحب کے
سیرت نگاروں کو اس سے فائدہ پہنچنے کی امید ہے۔

(عبدالمجید)

(۱) ایک روز طہارت کے اسلامی قواعد کا ذکر اتفاقاً چھڑ گیا، اس سلسلے میں غیر مسلم قوموں کی طہارت بھی معرضِ بحث میں آئی۔ ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے "میں جب طالب علمی کے سلسلے میں انگلستان گیا تو میرا لوٹا میرے ساتھ تھا، میں جب کبھی رفعِ حاجت کے لئے غسل خانے جاتا تو میرا لوٹا میرے ساتھ ہوتا۔ چند روز اسی طرح سے گزرے۔ آخر میری میزبان یعنی مالکہ مکان (Land lady) سے رہا نہ گیا (یہ خاتون پچاس سال کے لگ بھگ ہوں گی اور میرے ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آتی تھیں) مجھ سے پوچھنے لگیں یہ تم غسل خانے میں کیوں لوٹا لے جاتے ہو، میں نے ان سے کہا کہ اسلامی طہارت کا ایک قاعدہ یہ ہے کہ قضائے حاجت کے بعد صرف کاغذ یا مٹی کے ڈھیلے کا استعمال کافی نہیں ہے بلکہ پانی سے استنجا کرنا بھی ضروری

ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر گفتگو شروع ہوئی میں دیکھتے ڈاکٹر صاحب نے ان کے سامنے طہارت اور غسل کے اسلامی اصول بیان کیے مثلاً یہ کہ غسل جنابت مسلمان مرد اور عورت پر اسی طرح فرض ہے جس طرح عورت پر حیض کا غسل۔

میں نے کہا بڑی بی کبھی خاص غسل کی تو آپ کو اب حاجت نہ ہوگی البتہ طہارت کے لیے پانی ضرور استعمال کیا کیجئے۔ یہ باتیں سن کر بڑی بی بہت خوش ہوئیں اور فرمانے لگیں کہ ضرور ایسا کروں گی مسلمانوں کے یہ قواعد نہایت پاکیزہ ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ سائنس داں اور اہل طب کو اسلامی قواعد طہارت کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیے اور اس سلسلے میں جو کام اہل فقہ نے کیا ہے اسے بغور پڑھنا چاہیے۔

(۲) "یہود" کا لالچ اور دولت کا عشق ضرب المثل ہے۔ اس کے متعلق کئی مرتبہ ڈاکٹر صاحب سے میری گفتگو ہوئی۔ ایک مرتبہ مثال کے طور پر فرمانے لگے کہ جب میں انگلستان گیا تو میں نے ڈاکٹر آرنلڈ صاحب سے یہ خواہش کی کہ میرے قیام کا انتظام ایسے گھر میں کر دیا جائے جہاں ذبیحہ کا خاص انتظام ہو۔ یورپ میں صرف یہود اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں کہ صرف ذبیحہ کھائیں چنانچہ ایک یہودی کے گھر میں میری رہائش کا انتظام کر دیا گیا۔ ان لوگوں میں بہت خوبیاں تھیں یعنی "نماز" باقاعدہ پڑھتے تھے۔ جب میں گھر میں ہوتا تھا تو میں بھی شریک ہو جاتا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ مسلم ہونے کی وجہ سے حضرت موسیٰ میرے لیے بھی پیغمبر ہیں اور میں ان کی روش صحیح سمجھتا ہوں۔ وغیرہ لیکن کچھ عرصے کے بعد میرا دل ان لوگوں کی طرف سے کھٹا ہو گیا۔ مجھے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ چیزیں جن کی مجھے ضرورت ہوتی تھی اور جس کو میں

ان کے ذریعے سے منگواتا تھا' یہ لوگ دوکان داروں سے کمیشن لیا کرتے تھے'
ان کی اسی ایک عادت نے ان کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیا۔

(۳) ہندوستانی مذاہب پر ایک روز مجھ سے باتیں کر رہے تھے' بدھ مت کا ذکر آگیا۔ فرمانے لگے "انگلستان میں طالب علمی کے زمانہ میں مجھے ہر روز شام کے وقت اپنی قیام گاہ کی طرف ریل گاڑی میں سفر کرنا پڑتا تھا' یہ گاڑی ایک جگہ ختم ہوتی تھی' اور سب مسافروں کو سامنے والے پلیٹ فارم پر دوسری گاڑی میں سوار ہونا پڑتا تھا۔ گاڑی جب اسٹیشن پر پہنچتی تو گارڈ بلند آواز پکارتا (all change یعنی مسئلہ تناسخ) یعنی سب بدل جاؤ۔ ایک روز میں حسب معمول گاڑی میں بیٹھا تھا کہ میرے ارد گرد اخبار بین مسافر آپس میں بدھ مذہب کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ ایک صاحب نے میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ صاحب غالباً ایشیائی ہیں ان سے بدھ مذہب کے متعلق پوچھنا چاہیے' چنانچہ مجھ سے پوچھا گیا' میں نے کہا' ابھی جواب دیتا ہوں' یہ کہہ کر چپ رہا' چند منٹوں کے بعد انھوں نے مجھ سے دوبارہ پوچھا' میں نے پھر کہا ابھی جواب دیتا ہوں' وہ کہنے لگے شاید آپ جواب سوچ رہے ہیں' میں نے کہا ہاں' اسی دوران میں اسٹیشن آگیا اور گارڈ all change (یعنی مسئلہ تناسخ) چلانے لگا' میں نے کہا بس یہی بدھ مذہب ہے۔

(۴) کیمبرج کے زمانہ میں چند معترضوں سے مذہب پر بحث چھڑ گئی' ایک صاحب پوچھنے لگے مسٹر اقبال یہ کیا بات ہے کہ جتنے بھی پیغمبر اور بانیان مذہب دنیا میں آئے وہ بلا استثناء ایشیا میں مبعوث ہوئے' یورپ میں ایک بھی پیدا نہیں ہوا' ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا جی شروع شروع میں خدا نے

اور شیطان نے اپنا اپنا بیڑا اچھالیا، اللہ میاں نے ایشیا کو پسند کیا اور شیطان نے یورپ کو۔ اسی لیے پیغمبر جو اللہ میاں کی طرف سے آئے ہیں ایشیا میں مبعوث ہوئے۔ وہ صاحب بول اٹھے تو پھر شیطان کے پیغمبر کیا ہوئے؟ انھوں نے جواب دیا: یہ تمھارے میکاؤلی اور بشمول اہلِ سیاست اس کے رسول ہیں۔ اس پر بہت قہقہہ پڑا۔

(۵) یورپ اور انگلستان میں اس وقت بھی ہزاروں اشخاص ایسے موجود ہیں جن کے خیال میں ہندوستان میں صرف بڑے بڑے دریا، پہاڑ، جنگل، بیابان، چند بڑے بڑے شہر، شیر، سانپ، بچھو، بھیڑیے اور جنگلی لوگ پائے جاتے ہیں۔ یہ خیال بہت کچھ یورپین پادریوں، سرکاری ملازموں اور سیاحوں کی جدتِ طبع کا مرہونِ منت ہے۔ اسی طرح سے یہ لوگ اپنی بہادری اپنے معاصروں پر جتا سکتے ہیں اور گپیں ہانک کر مجلسوں کو گرما سکتے ہیں۔

چنانچہ طالب علمی کے سلسلے میں جب اقبال انگلستان گئے (یہ ۱۹۰۵ء کا زمانہ تھا) تو انھیں بھی اس طرزِ خیال کا تجربہ ہوا۔ ایک مجلس میں ایک لیڈی صاحبہ پوچھنے لگیں کیوں مسٹر اقبال! کیا آپ کے پلنگ کے نیچے بھی ہر روز صبح کے وقت سانپ ہوتا تھا؟ ڈاکٹر صاحب نہایت سنجیدگی سے بولے نہیں بی جان ہر روز نہیں، تیسرے دن۔

(۶) ایک مرتبہ ایشیا اور یورپ کے باہمی فرق و امتیاز کا ذکر ہو رہا تھا۔ میں نے پوچھا کیا ایشیا اور یورپ کی عورتوں میں بھی وہی فرق ہے جو ان ممالک کے مردوں کے درمیان ہوتا ہے؟ اس سلسلے میں میں نے انگریز اور جرمن عورتوں کے باہمی امتیاز اور فرق کے متعلق ڈاکٹر صاحب سے پوچھا (انگریز اور جرمن عورتوں کی تخصیص اس لیے کی تھی کہ ڈاکٹر صاحب طالب علم تھے

زمانے میں زیادہ تر ان ہی ملکوں میں رہے تھے) فرمایا "انگریز عورت میں وہ تو نسائیت اور وہ بے ساختگی نہیں جو جرمن عورت میں ہے۔ جرمن عورت ایشیائی عورت سے ملتی جلتی ہے، اس میں محبت کی گرمی ہے۔ انگریز عورت میں یہ گرمی نہیں انگریز عورت گھریلو زندگی اور اس کی بندشوں کی اس طرح شیدا نہیں جس طرح کہ جرمن عورت ہے۔" میں نے عرض کیا آپ کے اس خیال کی تصدیق مسٹر ڈبلیو ٹی سٹیڈ

(W. T. Stead) (جو انگلستان کے مشہور ریاست داں تھے اور کسی زمانہ میں انگریزی رسالہ ریویو آف ریویوز کے مدیر بھی تھے) کے ایک قول سے ہوتی ہے جو اس وقت مجھے یاد ہے۔ ایک موقع پر انھوں نے یہ کہا تھا کہ جرمن عورتیں درحقیقت پردہ میں ہیں۔ (یہ قول زمانہ قبل از جنگ کا ہے لیکن کوئی تعجب نہیں اگر اب بھی صحیح ہو) انگریز اور امریکن عورتوں کی آزادی کے مقابلہ میں جرمن عورتیں تقریباً پردہ ہی میں ہیں۔

(۲) طالب علم کے سلسلہ میں جب ڈاکٹر صاحب لندن میں تھے تو مرحوم علیہ الرحمۃ کے ایک رفیق جن کا اسم مبارک مولوی .... صاحب تھا (غالباً آپ ایڈووکیٹ تھے) سیاحت کے سلسلے میں یورپ کی سیر کرتے ہوئے انگلستان پہنچے (ان بزرگ کو میں نے ۱۹۱۰ء میں مسلم یونیورسٹی کے وفد میں لاہور میں دیکھا تھا میں ان دنوں اسلامیہ اسکول میں پڑھتا تھا) اس وقت مولوی صاحب کل وضع قطع میں بالکل سرسید کا مثنیٰ تھے۔ (ترکی ٹوپی لمبی سفید داڑھی سیاہ مارننگ کوٹ وغیرہ الغرض چھوٹے پیمانے پر سرسید معلوم ہوتے تھے) پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ جنھیں اقبال سے شغف تھا اور جن کی توجہ سے اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں ہی مستفید ہوئے تھے، ان دنوں لندن یونیورسٹی

میں عربی کے پروفیسر تھے اور اقبال کے مربی خاص تھے بلکہ جب پروفیسر موصوف چند ماہ کے لئے مصر تشریف لے گئے تو اقبال ہی کو وہ اپنا جانشین بنا گئے تھے۔

مولوی صاحب لندن میں تشریف لائے چونکہ پروفیسر آرنلڈ سرسید مرحوم کے حلقہ اثر کی بنا پر علی گڑھ کالج میں رہ چکے تھے اس لئے مولوی صاحب انہی کے پاس گئے۔ انھوں نے اقبال کو حکم دیا کہ بھئی مولوی صاحب کو لندن کی تمام قابل دید جگہیں اور چیزیں دکھا دو ...... اقبال نے نہایت تندہی سے مولوی صاحب کو جگہ جگہ پھرایا اور شام کے قریب کسی قہوہ خانے میں جا بٹھایا۔ وہاں چائے اور قہوہ کے علاوہ چند حسن پیشہ لڑکیاں بھی موجود تھیں اور خدا جانے اقبال کے اشارے یا خود اپنی جولانی طبع سے وہ مولوی صاحب قبلہ کے گرد جمع ہو گئیں، کوئی مولوی صاحب کو قہوہ پینے کی تلقین کرتی، کوئی ان کی نورانی داڑھی پر رشید الحق، ایک دو نے تو شاید مولوی صاحب کے رخساروں پر عقیدت مندی کی ایک دو مہریں بھی جڑ دیں۔ اس مصیبت سے جب ان کو نجات ملی تو وہ غصے سے بھرے ہوئے پروفیسر آرنلڈ کی خدمت میں پہنچے اور اقبال کی شکایت کی، دوسرے روز جب اقبال پروفیسر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ بہت خفا تھے۔ فرمانے لگے اقبال تم لندن میں آکر بے حد شریر ہو گئے ہو تمہیں شرم نہ آئی، مولوی صاحب ایسے بزرگ کو اس قہوہ خانے میں لے گئے۔ اقبال نے نہایت متانت سے جواب دیا "قبلہ آپ نے مجھے حکم دیا تھا کہ لندن کی تمام قابل دید جگہیں مولوی صاحب کو دکھا دو اگر میں مولوی صاحب کو صرف لندن کا عجائب خانہ، چڑیا گھر، محلات شاہی عمارتیں وغیرہ ہی دکھلا دیتا تو وہ لندن کے متعلق سخت غلط فہمی میں مبتلا رہتے۔

اور ہندوستان جاتے ہوئے لندن کے متعلق نہایت غلط اور یک طرفہ خیالات
لے کر چلے تھے۔ لندن کی زندگی تھی وہ خانوں کا گنج خواہ برا ہو یا بھلا بہت اہم ہے
اسی لئے میں نے مناسب سمجھا کہ مولوی صاحب کو یہ تاریک پہلو بھی دکھا دوں
میں بعض جان بوجھ کر وہاں لے گیا تھا" اقبال کا یہ خیال کہ زندگی کا ہر پہلو دیکھنے
سمجھنے اور تجربہ کرنے کے لائق ہے" ان کے اسلامی فلسفے کا ایک اہم رکن تھا
(اسی خیال سے مجبور ہو کر انہوں نے سوامی۔ بی۔ کے سوانح نگاروں کو ٹوکا تھا۔
دیکھئے نیچے فقرہ نمبر ۲)

(۲) جسم اور روح کی جو غلط تقسیم پرانے زمانے سے فلاسفہ اور مذاہب
میں ہو چکی ہے اس کے برے نتائج میں سے سب سے برا نتیجہ یہ ہے کہ عام مذاہب
میں جسم اور اس کی خواہشات کو برا کہا گیا ہے۔ لیکن اسلام میں نہ "جسم"
کو کبھی برا کہا گیا اور جسمانی لذات کو کوسا گیا ہے۔ صرف اس کی حدیں
مقرر کر دی گئی ہیں۔ جو شخص اسلامی حدود کے اندر رہ کر جسمانی لذات حاصل
کرے اس سے مواخذہ نہیں اور نہ وہ گنہگار ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ
ان لذات میں ترتیب کا لحاظ رکھے اور اعلیٰ کو ادنیٰ کے لئے قربان نہ کرے
دوسرے مذاہب کے بانی اور پیرو لذات جسمانی سے اس قدر متنفر ہیں کہ
خود "جسم" کا وجود ہی گناہ تصور کیا جاتا ہے اور اس گناہ کا کفارہ صرف یہ
سمجھا جاتا ہے کہ ہر طرح سے جسم کو ایذا دی جائے اور جسمانی لذات کے حصول
کو گناہ کبیرہ سمجھا جائے۔ "دختر جسم" میں خودی ہے" جس قدر اس کو ٹھکراؤ بگڑتا
ہے "دباؤ ابھرتا ہے" لذات سے محروم رکھو تو ہر وقت ان ہی کی فکر میں رہتا
ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس اسلامی تعلیم کو بار بار اور نئے نئے رنگ میں اپنی نظمات
میں بیان کیا ہے۔

قریباً بارہ یا تیرہ سال ہوئے ہیں ایک روز شام کے وقت ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا باتوں باتوں میں مذہبی مسئلہ معرض بحث میں آ گیا۔ فرمانے لگے "ابھی چند ہی روز ہوئے کہ مجھے اس اخلاقی تعلیم کی صحت کا ثبوت ضمناً ذکر کرنا پڑا۔ اور دو تین ہندو صاحبان میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہم نے شری سوامی جی کی سیرت لکھی ہے۔ آپ چونکہ سوامی جی کے گہرے دوست تھے اسلئے آپ اس سیرت پر نظر ثانی فرمائیں اور ہمیں مزید مواد دیں۔ بلکہ خود بھی کچھ لکھیں وغیرہ۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا جو آپ نے سیرت لکھی ہے، دکھائیے۔ ڈاکٹر صاحب نے کتاب کو جستہ جستہ دیکھا۔ یہ سیرت بالکل اسی طرح لکھی گئی تھی جیسے اس نوع کی کتابیں بالعموم لکھی جاتی ہیں۔ یعنی ممدوح کو فرشتہ سیرت، ولی اور ہر قسم کی لغزشوں اور نقائص سے مبرا اور منزہ ثابت کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان سے فرمایا "آپ لوگوں نے سوامی جی کی زندگی سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ اور نہ اس درس عبرت کا جو ان کی زندگی سے حاصل ہو سکتا ہے اس کتاب میں ذکر ہے۔" انہوں نے پوچھا وہ کیا؟ فرمایا "آپ کو معلوم ہے کہ فلاں سال سوامی جی اپنی تعلیم ویدانت اور "برہمچاریہ" کے پرچار کے لئے امریکہ تشریف لے گئے تھے۔ وہاں بعض لوگ جن میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھے، ان کے حلقہ اثر میں آ گئے۔ ان میں ایک مریدنی ضرورت سے زیادہ فیضیاب ہوئی۔ لیکن واپسی پر سوامی جی اس عورت اور بچہ دونوں کو امریکہ ہی میں چھوڑ آئے۔ یہ واقعہ ایک نہایت اہم اور عبرت آموز سبق ہے جو سوامی جی کی زندگی سے حاصل ہوتا ہے کہ وہ خود "برہمچاریہ" کو نباہ نہ سکے اور انہوں نے اس فعل سے اپنی تعلیم کو غلط ثابت کر دکھایا۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ اس غلط تعلیم

اور غلط اصول کو چھوڑتے تھے۔ انھوں نے اپنی ناکامی کو چھپانا چاہا اور اس وجہ سے انھوں نے بچے اور اس کی ماں کو امریکہ میں چھوڑ کر ایک اخلاقی گناہ کا ارتکاب کیا۔ آپ لوگوں کا فرض تھا کہ سوامی جی کی زندگی کے اس اہم واقعہ کو قبول کر لیا کرتے تاکہ معلوم ہوتا کہ وہ اپنی تعلیم میں جس کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی کس حد تک کامیاب رہے۔"

ڈاکٹر صاحب کی یہ بات ان دوستوں کو کیوں بھاتی۔ کہنے لگے جنابِ والا ان باتوں کو کتابوں اور سیرتوں میں لکھنا نہیں چاہیے۔ یہ کہہ کر وہیں چلے گئے۔

میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ سوامی جی سے آپ کی دوستی کس زمانے میں تھی؟ فرمایا کہ لاہور میں طالب علمی کے زمانے ہی میں میری ان سے دوستی بڑھ گئی تھی۔ میں نے انھیں مثنوی مولانا روم سے آشنا کیا تھا بلکہ پڑھائی بھی تھی۔ سوامی جی سے میں نے سنسکرت سیکھنا شروع کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب سوامی جی کے خلوصِ نیت اور روحانی سرشاری کے بہت معترف تھے اور اسی لیے وہ سوامی جی کے برہمچاریہ کی ناکامی میں ان کی حیات کا اہم ترین سبق پا گئے تھے۔ یعنی جو بات سوامی جی سے بھی نبھ نہ سکی وہ ہے غلط۔

(۵) چند سال ہوئے ایک جرمن یا آسٹرین سیاح ڈاکٹر صاحب کے پاس آیا۔ آپ اس زمانہ میں میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں مقیم تھے۔ سیاح صاحب "جہاں گرد" (Globe Trotter) تھے۔ علی بخش (ڈاکٹر صاحب کا ملازم) اسے پہلے دیکھا تو معلوم ہوا کہ پہچانتا ہے ان کا کوئی عزیز ہے۔ اسے اندر بلوایا گیا اور ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس نے ڈاکٹر صاحب کو اپنی بیاض دکھائی جس میں ہر ملک کے مشہور و معروف لوگوں نے اپنے ہاتھ سے کچھ نہ کچھ لکھا تھا۔ سیاح مذکور نے ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی کہ آپ بھی اس میں کچھ لکھ دیں۔

انھوں نے قاری کو ایک قطعہ لکھ کر دستخط کر دیے۔ اس نے پوچھا آپ کس چیز کی تعلیم دیتے ہیں؟

جواب میں فرمایا میرے آباؤ اجداد برہمن تھے۔ انھوں نے اپنی عمریں اسی سوچ میں گزار دیں کہ خدا کیا ہے؟ میں اپنی عمر اسی سوچ میں گزار رہا ہوں کہ انسان کیا ہے۔

(۱۰) سنہ ۱۹۳۲ء میں ایک روز شام کے وقت میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر تھا کہ علی بخش نے اطلاع دی کہ چند طالب علم ملنے کو آئے ہیں۔ جاڑے کا موسم تھا۔ ڈاکٹر صاحب بڑے کمرے میں بیٹھے تھے (بالعموم وہ شام کے وقت بستر پر بیٹھے تھے اور ملاقاتی وہیں کرسیوں پر بیٹھ جاتے تھے) لڑکے اندر آئے۔ یہ اسلامیہ کالج کے طلبہ تھے۔ میں چونکہ اسلامیہ کالج میں ملازم تھا، اس لیے ان کی گفتگو سننا چاہتا تھا مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں وہ شام کے وقت وفد کی صورت میں کیوں حاضر ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے دریافت فرمایا "کیوں بھئی کیسے آئے"۔ انھوں نے جواب دیا کہ ایک مشاعرہ کرنے کا ارادہ ہے۔ جناب والا اگر اس کی صدارت قبول فرمائیں تو عزت افزائی ہوگی، اور لوگ بھی بہت جمع ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "صدر" تو میں کسی مجلس یا جلسہ کا بننا نہیں چاہتا، البتہ "شعر بازی" سے تمھیں روکتا ہوں، اس وقت ہندوستان کو اور بالخصوص مسلمانوں کو "شعر بازی" کی ضرورت نہیں، اور نہ ہر شخص شعر کہنے کے قابل ہوتا ہے۔ لوگ شعر بازی کی طرف اس لیے جلد متوجہ ہو جاتے ہیں کہ بغیر کاوش، مطالعہ اور محنت کے انھیں شہرت حاصل کرنے کی خواہش دامنگیر ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس وقت بہت کم ایسے شاعر ہیں جن کے کلام میں بقا کا عنصر موجود ہو۔ آپ نوجوان ہیں، آپ کو اس غلط روش پر ہرگز نہ چلنا چاہیے، ضرورت ہے نثر نگاروں کی جو

محنت اور مطالعہ کے بعد اردو زبان میں مختلف موضوعوں پر کتابیں، رسالے، تراجم وغیرہ لکھیں اور اپنی قوم اور خود اپنے آپ کو بہتر بنائیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تقریر کا گو نمایاں اثر حاصل تھا، چنانچہ ان کی تقریر نے ان نوجوان شعراء کے جوش کو ٹھنڈا کیا اور وہ یہ سمجھ کر کہ بورڈنگ ہاؤس میں چلے آئے۔

(۱) ۱۹۲۵ء میں ایک مشہور بزرگ لاہور میں تشریف لائے۔ ان کی لیاقت، وسعت علم اور بالخصوص فصاحت و بلاغت کے متعلق عوام میں بہت مبالغہ آمیز باتیں مشہور تھیں۔ ان کی تقریر میں بہت کم لوگ ان کی ہمسری کر سکتے تھے اور انگریزی زبان محاورہ تلفظ اور ادب میں تو انھیں بڑی دسترس حاصل تھی۔ میں نے ایک روز ڈاکٹر صاحب سے ان کی بہت تعریف کی، وہ بزرگ بھی انھیں دنوں وارد ہوئے تھے۔ ....

فرمایا کہ انگریزی کی تقریروں میں ان کا پایہ بلند ہے، لیکن یاد رکھو کہ انبیاء علیہم السلام اور مصلحین اقوام کو چھوڑ کر، جو لوگ بے ضرورت اٹھتے بیٹھتے تقریریں کرتے رہتے ہیں، ان میں روحانیت کا فقدان ہوتا ہے۔

In people other than Prophets and great national reformers, too much of Public speaking is very afoten a sign of spiritual Poverty.

"باقی" حضرات کے متعلق تو یہ نظریہ بالکل صحیح ہے۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ بعض بڑے بڑے مقرروں کے متعلق بھی یہ نظریہ غلط نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ مجھے بھی مولانا شبلی کے ساتھ میں بھی تقریروں کے شوق میں کچھ عرصے کے لئے بہت جھنک رہا، لیکن بعد میں میں نے اسے بالکل ترک کر دیا۔ علامہ نے جو تجزیہ اوپر بیان فرمایا ہے، اس میں "بے ضرورت" Too much یا "ضرورت سے زیادہ"

پُر زور ہے۔ عوام اور سامعین سے خراجِ تحسین حاصل کرنے میں مقرر صاحب کو وہ لطف حاصل ہوتا ہے کہ وہ مسئلہ زیرِ بحث پر پورا عبور کیے بغیر دعوے اور دعاوی تقریر کر جاتے ہیں۔ کسی نے اپنے بزرگوں کے اقوال اور تقریروں میں خطابت کا عنصر زیادہ نمایاں ہوتا ہے بہت کم مقرر ایسے ہوتے ہیں جو کاوش اور مطالعے تک پہنچے آپ کو اس خطرے سے محفوظ رکھتے ہیں۔ ان کی تقریروں کے برعکس جو شخص کچھ لکھ کر دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ الفاظ پر غور کرتا ہے اور جب تک اسے اپنی بات اور اپنے استدلال پر پورا یقین نہیں ہوتا وہ انہیں عوام کے سامنے پیش کرنے سے گریز کرتا ہے۔ اس حقیقت کو البتہ فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ عوام کے دلوں کی تسخیر کے لئے جو طاقت اور جذب تقریر میں ہو سکتا ہے وہ تحریر میں ممکن نہیں۔

انبیاء اور مصلحین تو ہر وقت فکر و عمل میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ جب تقریر کرتے ہیں تو ان کے الفاظ ان کے فکر و عمل اور ان کی روحانیت و ایمان کو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ وہ شوقِ تقریر سے مجبور ہو کر نہیں بولتے بلکہ صرف اس لئے بولتے ہیں کہ بغیر تقریر کے چارہ نہیں۔ .... ان کی تقریر پر اثر و روحانیت ہوتی ہے کیونکہ خود خدا ان کو سکھانے والا ہوتا ہے عَلَّمَہُ الْبَیَان

(۱۲) ۱۹۳۲ء کے شروع میں ایک شام کو میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بحیثیت مدیر کریسنٹ Crescent (رسالہ اسلامیہ کالج لاہور) حاضر ہوا اور عرض کیا کہ نئے سال کا پہلا نمبر نکل رہا ہے براہ کرم کوئی پیغام یا ارشاد طلبہ کے لئے دیجئے تاکہ پہلے ورق پر اسے چھاپا جائے۔ فرمانے لگے مضمون لکھنے کا تو وقت نہیں البتہ یہ شعر چھاپ دو کہ

بہ شیون تو اگر لعلے ز میراثِ پدر خواہی
کجا عیشے برون آوردنِ لعلے کہ در سنگ است

میں نے اُسے چھاپ دیا۔ اس سے بہتر پیغام مسلمان طلبہ کے لئے تو شاید ناممکن تھا۔

(۱۳) ۱۹۲۶ء یا ۱۹۲۷ء میں جب مسٹر منوہر لال وزیر تعلیم پنجاب تھے، تو مسلمانوں میں ان کی حق تلفی کا بہت چرچا تھا۔ ڈاکٹر صاحب محکمۂ تعلیم کے نیچے ان دو مسرجان انڈرسن تھے۔ مسلمان ممبران کونسل کا ایک مختصر سا وفد اس معاملہ پر بحث کرنے کے لئے ڈائرکٹر صاحب کے پاس گیا۔ ڈاکٹر صاحب چونکہ ان دنوں کونسل کے ممبر تھے اور تعلیمی حالات سے واقف، وہ بھی وفد میں شامل تھے۔ رسمی باتیں جو ایسے موقعوں پر ہوتی ہیں ہوئیں۔ ڈائرکٹر صاحب بہادر نے وعدہ فرمایا کہ میں ضرور اس معاملہ پر غور کروں گا اور جہاں حق تلفی یا بے قاعدگی ہوئی ہے اس کی تلافی کی پوری کوشش کروں گا۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً ظرافت سے کام لیا اور سرجارج سے فرمانے لگے: "ابی صاحب آپ آئی کاوش مت کیجئے گا، ہم لوگ تو مسلمان ہیں، آپ کے اس وعدے ہی سے خوش ہو گئے ہیں، اب کچھ کرنے کرانے کی ضرورت نہیں۔"

(۱۴) ۱۹۲۲ء میں جب ڈاکٹر صاحب کو نائٹ ہڈ Knight hood. کا خطاب ملا تو اسلامیہ کالج کے کریسنٹ ہوسٹل کے طلبہ نے آپ کو چائے پر مدعو کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کمال مہربانی سے دعوت، جو ان کا عمر بھر شیوہ رہا، یہ دعوت قبول فرمائی۔ چنانچہ وقت مقررہ پر آپ تشریف لائے۔ آپ کے دوست نواب سر ذوالفقار علی خان صاحب بھی ساتھ تھے۔ چائے کے بعد طلبہ نے درخواست کی کہ ان کی ہدایت کے لئے چند کلمات فرمائے جائیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک مختصر سی تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ قوموں کے اخلاق کو خراب کرنے والی چیزوں میں ایک نہایت خطرناک چیز یہ نظریہ ہے جسے "فن برائے فن" art for art's sake.

کہتے ہیں، اس نظریے سے مراد یہ ہے کہ جمالیات کا ہر شعبہ یا فن صرف اپنے اصولوں کو ہی اپنا معیارِ صحت اور نصب العین مقرر کرے، اپنے ان اصولوں سے باہر کوئی اصول (مثلاً اخلاقیات یا روحانیت کا کوئی اصول) اس فن کی راہبری کا حق دار نہ ہو، وہ فن خود اپنا راہبر ہو، اس کی ترویج یا ترتیب یا اس کا ارتقا کسی فوق الفن اصول کے ماتحت نہ ہو وغیرہ۔ مختصر یہ کہ حسن خود اپنا معیار ہے، اور اپنے سے بالاتر کسی معیار یا مدعا یا نصب العین کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ یہ نظریہ آج کل مغربی دنیا میں بہت مقبول ہے اور اس کی مقبولیت کی رفتار اگر اسی طرح تیز رہی تو مجھے یقین ہے کہ وہ ان اقوام کو گمراہ کر دے گا۔ میں نے اپنے کلام میں اس مہلک نظریے کے خلاف جہاد کیا ہے اور میں تم نوجوانوں کو متنبہ کرتا ہوں کہ اس خطرناک غلطی میں نہ پڑنا۔ "فن" جب اخلاقیات اور حیاتیات سے علیحدہ ہوتا ہے تو وہ بہت جلد مخربِ اخلاق بن جاتا ہے۔ اعلیٰ مقاصد کی تحصیل یا پیروی کے لئے جمالیات کے کسی فن کو لو گے تو وہ اپنے بہترین مدارج طے کرے گا، اور قوم و ملت میں ایک نئی روح پھونک دے گا لیکن وہی فن جب ان مقاصد سے بچھڑ جائے گا، تو قوم و ملت کے حق میں زہرِ قاتل بنے گا۔"

میں نے اوپر ڈاکٹر صاحب کی مختصر تقریر کا ماحصل (جو شاید دس یا دو منٹ سے زیادہ نہ تھی) اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ بالخصوص اس نظریۂ "فن برائے فن" کی تعریف کو واضح کر کے بیان کرنا میں نے مناسب سمجھا ہے۔ اس تقریر کو سنے مجھے کئی سال گزر چکے ہیں، لیکن بعد کے واقعات نے ان خیالات کو میرے ذہن سے محو ہونے نہیں دیا۔ ہر وقت "فن برائے فن" کی تباہ کاریاں ایک وبائی صورت اختیار کر رہی ہیں، جرمنی اور اٹلی میں تو ہٹلر اور مسولینی کی کوششوں نے اس نظریہ کی اچھی خاصی بیخ کنی کی ہے، لیکن دوسرے مشہور مغربی ممالک میں اس کے خلاف کوئی منظم جہاد نہیں کیا گیا، ہندوستان میں کچھ عرصے

یہ نظریہ تمام نو تعلیم یافتہ طبقہ میں رائج ہو رہا ہے آزاد خیال فنین artists. اس کے مبلغ ہیں اور عریانیت ان کے فن کے اسرار کی کلید۔ ڈاکٹر صاحب نے اس نظریہ کے مہلک نتائج کو جگہ جگہ اپنی تصانیف میں مثلاً محکوم اور زوال پذیر اقوام کے جمالیات کے تذکرہ میں بیان کیا ہے۔ اس نظریہ کے برعکس انہوں نے اپنی تعلیم اس شعر میں نہایت بلیغ طریقے سے بیان کی ہے:

دلبری بے قاہری جادوگری است
دلبری با قاہری پیغمبری است

(۵) ۱۹۳۵ء میں میں نے اسلامیہ کالج کو چھوڑا۔ ممبران اسٹاف نے کمال مہربانی سے چائے کی ضیافت دی۔ ڈاکٹر صاحب سے چونکہ مجھے عقیدت تھی اس لئے انہیں بھی مدعو کیا گیا (ویسے اساتذہ کے علاوہ صرف وہی مہمان تھے۔) وہ ازراہِ ذرہ نوازی شامل ہوئے، باتیں ہوتی رہیں۔ دوران گفتگو میں منتظم صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی شرکت کا شکریہ ادا کیا۔ فرمانے لگے پروفیسر میرا دوست ہے اس کے لازمی جنازہ کے لئے مجھے ضرور وقت نکالنا تھا۔

The Professor is my friend, I had to find time for his official funeral

اس پر قہقہہ پڑا۔ فرمانے لگے کہ میں نے ان الوداعی پارٹیوں کے لئے "لازمی جنازے" کی اصطلاح وضع کی ہے:

اس پارٹی میں ڈاکٹر صاحب، مسٹر یوسف علی (جو پرنسپل تھے) کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی رہے تھے۔ باتوں باتوں میں پردہ کا معاملہ زیر بحث آیا۔ یوسف علی صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کیوں صاحب آپ کو تو پردہ کی مخالفت ضرور کرنی چاہئے! انہوں نے جواب دیا کہ میں تو پردہ کا بہت حامی ہوں۔ یوسف علی صاحب نے وجہ

دریافت کی تو فرمایا کہ پردے سے جنسیت کی خواہش تیز تر ہوتی ہے اور بے پردگی اور عریانی سے وہ ادا نکل جاتی ہے جو جنسیت کی جان ہے۔" اس مختصر سے جواب میں انھوں نے انسانی نفسیات کے ایک اہم اصول کو لطیف پیرایہ میں بیان کر دیا۔

(۱۲) ڈاکٹر صاحب کو پورا یقین تھا کہ اُن کا کلام اور اُن کا نام باقی رہے گا۔ عرصہ ہوا میں نے ایک روز عرض کی کہ یورپی زبانوں میں آپ کا کلام اگر ترجمہ کی صورت میں شائع ہو جائے گا تو نہ صرف تمام یورپ کے حق میں مفید ہوگا بلکہ صحیح اسلامی نقطۂ نگاہ اور تعلیم کے متعلق تمام یورپ میں جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں، وہ بہت حد تک دُور ہو جائیں گی۔ آپ ترجمہ کی اجازت ضرور دیں۔ فرمانے لگے کہ میرا کلام باقی رہے گا (my work shall live.) ترجمے آہستہ آہستہ ہو ہی جائیں گے۔

گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں انگلستان میں ڈاکٹر صاحب کو اکابر اور فضلاء سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملا۔ ایک بزرگ نے عیسائی پادریوں کا مشہور اور تھوتھا اعتراض اسلام کے خلاف دُہرایا اور پوچھا کہ "کیا یہ سچ ہے کہ اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ عورت کے روح نہیں ہوتی؟"

ڈاکٹر صاحب نے پوچھا کیا روح سے آپ کی مراد وہی شے ہے جو آپ لوگوں کے خیال میں جسم سے بالکل علیحدہ اور مختلف ہوتی ہے۔" معترض صاحب نے کہا جی ہاں۔ انھوں نے جواب دیا "تو پھر صاحب اسلام کے مطابق عورت کیا مرد میں بھی روح نہیں ہے۔" اس دقیق اور لطیف جواب کو سمجھنے کے لیے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے فلسفیانہ مضامین میں اس نظریہ پر بہت زور دیا ہے کہ روح اور جسم کی تقسیم قرآنی تعلیم کے بالکل خلاف ہے

اور یہ پرانے مذاہب اور فلاسفہ کی غلط تعلیم کا نتیجہ ہے۔ قرآن کے مطابق انسان ایک فرد ہے جس میں روحانی اور جسمانی خاصیتیں موجود ہیں۔ لیکن روح اور جسم دو الگ الگ چیزیں موجود نہیں، جن سے وہ بنا ہو۔ روح اور جسم کی یہی غلط تقسیم ہے جس کی وجہ سے بیسیوں ناقابلِ حل مسئلے فلسفہ و مذہب میں پیدا ہو چکے ہیں۔

اسلام انسان کو ایک زندہ شخصیت Spiritual and organic being تصور کرتا ہے اور یہ تصور قرآن میں نہ صرف اسی ارضی زندگی کے لیے استعمال ہوتا ہے بلکہ حشر اور حیات بعد الموت کے لیے بھی قائم رہتا ہے۔ چنانچہ حیات بعد الموت میں انسان کے لیے جو جزا اور سزا مقرر ہے جس کا ذکر قرآن میں بار بار آتا ہے، وہ روحانی بھی ہے اور جسمانی بھی۔ ڈاکٹر صاحب نے مندرجہ بالا جواب میں اس مسئلہ کو واضح کیا ہے کہ اسلام کے مطابق روح جسم سے کوئی علیحدہ شے نہیں، اس لیے نہ وہ عورت میں پائی جاتی ہے اور نہ مرد میں۔ اس بلاغت اور ظرافت سے ایک ہی بات میں نہ صرف ایک جھوٹے الزام کی تردید کی گئی ہے بلکہ ایک اصول کو بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی روزمرہ کی گفتگو میں یہی خاصیت بار بار نمایاں ہوتی تھی۔

(۲) دوسری گول میز کانفرنس کے زمانہ میں انگلستان کی مشہور سیاح خاتون مس روزیتا فوربس (" Miss Rosita Forbes.) نے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا شوق ظاہر کیا۔ چنانچہ مس صاحبہ نے انھیں اپنے ہاں مدعو کیا۔ یہ خاتون شمالی افریقہ اور اسلامی ممالک میں بہت پھری ہیں اور ان پر اس سیاحت کا بہت اچھا اثر پڑا ہے۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے کہ ان کا محل جو لندن میں ہے، وہ ایشیائی بلکہ اسلامی طرزِ آرائش کا نہایت لطیف اور شستہ نمونہ ہے، سامانِ آرائش نفاست سے

زیب و زینت کے انداز ہر لحاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہارون الرشید کے بغداد کے کسی محل کا خاکہ ہے، اسی محل میں ڈاکٹر صاحب کی ضیافت ہوئی، اور پُرتکلف مجلس رہی لیکن انھیں خاتون کے محل کی تعریف کا موقع نہ ملا۔ روانگی کے وقت مس صاحبہ سے نہ رہا گیا۔ پوچھنے لگیں "مسٹر محمد! میرے اس مکان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "آپ نے اپنی جنت دنیا میں پالی۔ میں اپنی جنت کا منتظر ہوں۔"

(۱۸) دوسری گول میز کانفرنس سے واپسی پر ڈاکٹر صاحب کی ملاقات روما میں مسولینی سے ہوئی۔ اس ملاقات میں مسولینی نے ان کی شخصیت سے دلچسپی کا اظہار کیا اور اس کی تعریف کی۔ یہ گفتگو آدھ گھنٹے سے زیادہ رہی۔ دورانِ گفتگو میں قوم اور مذہب کا بھی ذکر ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اٹالیہ کی موجودہ حالت (اور اس کی جنگ طلبی) بہت حد تک ایسی ہے جیسے کہ قبل از اسلام ایران کی تھی، ایران کی تہذیب فرسودہ تھی، اور قوم کے قویٰ شل ہو چکے تھے، ان کو تازہ خون کی ضرورت تھی، ایران کی خوش قسمتی سے اس کے جوار میں عرب کی جری اور بادیہ پیما قوم تھی جس نے ایران کو اپنا تازہ اور خالص خون دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ایران میں حیات کی ایک نئی لہر دوڑ گئی اور یہ قوم ایک پُرشکوہ تہذیب کی حامل اور علم بردار ہوئی۔ عربی خون کی بدولت ان میں بہترین اہلِ فن، اہلِ سیاست اور اہلِ صنعت پیدا ہوئے۔ اسی طرح روما کے زوال کے بعد گاتھ اور جرمن قوموں نے اٹلی کو اپنا خون دیا اور اسے قرونِ وسطیٰ میں نشاۃ ثانیہ نصیب ہوئی۔ اب پھر ایران اور اٹلی دونوں کو تازہ خون کی ضرورت ہے۔ ایران اب بھی اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ اس کے شمال میں جری اور غیر مہذب ترکمان موجود ہیں، اور مغرب میں اندرونِ عرب کے جری قبائل، یہ قومیں اپنا خون دے کر ایران کو پھر زندہ اور قوی کر دیں گی۔ لیکن موجودہ اطالیہ کے گرد ایسی ہی مہذب قومیں آباد ہیں جن میں صحرائی وحشت اور تازگی نام کو موجود

نہیں، اطالیہ تازہ خون کہاں سے لے گی؟"

ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے کہ مسولینی اس اچھوتے خیال سے بہت متاثر ہوا۔

(۲۰) ڈاکٹر صاحب پر حُسن کا اثر بہت گہرا اور فوری ہوتا تھا۔ روما کے اسی قیام کے زمانہ میں (جو صرف چند روزہ تھا) ان کی ایک دوست خاتون نے (غالباً اسی خاتون نے مسولینی کی ملاقات کے لیے وقت مقرر کرایا تھا) جو اطالیہ کے طبقۂ امراء سے تھی ان سے دریافت کیا: "اگر آپ کو یہاں کوئی خاص چیز دیکھنی ہے تو فرمائیے؟ تاکہ اس کا انتظام کیا جائے۔" فرمایا کہ "اطالیہ کا حسن مشہور ہے میں اس شہرِ رُوما کی حسین ترین خواتین دیکھنا چاہتا ہوں۔" چنانچہ موصوفہ نے ایک ٹی پارٹی میں اعلیٰ سوسائٹی کی چند حسین خواتین مدعو کیں، جن سے ڈاکٹر صاحب نے ملاقات کی۔ فرماتے تھے کہ "اطالیہ کا حسن یورپ میں بہترین ہے" اور اس ضیافت میں رُوما کے حسن کے بعض نہایت لطیف نمونے تھے۔

(۲۱) گول میز کانفرنس سے واپسی پر ڈاکٹر صاحب کی ملاقات پیرس میں پروفیسر برگساں سے ہوئی۔ برگساں کی تصانیف کا اثر ان پر بہت تھا۔ اس کا نظریۂ "اصلیتِ زمان" (Reality of time) ڈاکٹر صاحب کے خیال میں اسلامی نقطۂ نگاہ کے بہت قریب تھا۔ چنانچہ دورانِ ملاقات میں اس پر بحث ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے برگساں کو یہ حدیث سنائی کہ "زمانہ کو بُرا مت کہو کہ زمانہ خدا ہے۔" فرماتے تھے کہ جس وقت برگساں نے یہ حدیث سنی تو وہ کرسی سے اچھل کر آگے بڑھا اور مجھ سے پوچھنے لگا "کیا یہ سچ ہے؟"

(۲۲) گول میز کانفرنس کے اختتام پر ڈاکٹر صاحب نے ہسپانیہ کا سفر کیا۔ اس سفر کے واقعات انھوں نے کمالِ مہربانی سے مجھے مفصل سنائے۔ قرطبہ کے جس ہوٹل میں آپ ٹھہرے تھے، اس کے مالک (منیجر) سے آپ نے سب سے پہلے

بھی پوچھا کہ کیا اس علاقہ میں قدیم مراکشی نسل کے لوگ آباد ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ بڑی تعداد میں۔ آپ نے خواہش ظاہر کی کہ مجھے ان میں سے کسی ایک سے ضرور ملایا جائے۔ منیجر مسکرا کر بولا اس کام کے لیے ہوٹل سے باہر جانے کی ضرورت نہیں میں خود مراکشی نسل سے ہوں (جنوبی ہسپانیہ کے ان باشندوں کو مورسکو (Morisco.) کہا جاتا ہے) حسن اتفاق سے آپ کو غرناطہ کی عمارتیں دکھانے کے لیے جو راہبر مقرر کیا گیا تھا (آپ نے شرط یہ رکھی تھی کہ راہبر انگریزی جانتا ہو کیونکہ میں ہسپانوی زبان سے آشنا نہیں) وہ بھی مراکشی اصل سے تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اس علاقہ میں عربی مراکشی اثر شہریوں کی ساخت میں بہت نمایاں ہے۔ چنانچہ "مسجد قرطبہ" میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے:

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال — اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں
بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے — رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

اسی سفر ہسپانیہ میں آپ کو پروفیسر آسین Asin سے بھی ملاقات کا موقع ملا یہ وہی پروفیسر ہیں جنھوں نے قریباً پندرہ سال یا شاید کچھ زیادہ ہوتے ہیں، ایک معرکۃ الآرا تصنیف کی تھی جس میں یہ ثابت کیا تھا کہ اطالوی شاعر دانتے پر عربی بالخصوص ان حدیثوں اور روایتوں کا اثر جو معراج نبوی صلعم اور عذاب دوزخ سے متعلق ہیں کسی قدر غالب تھا۔ دانتے کی شہرہ آفاق تصنیف ڈیوینا کامیڈیا میں یہ اثر صفحہ صفحہ پر نمایاں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ پروفیسر آسین کی خواہش تھی کہ مسلمان طالب علم، بالخصوص ہندوستان کے طالب علم ہسپانیہ میں آئیں، اور ملک کی زبان سیکھ کر ان قیمتی اور بے شمار عربی مخطوطوں کا مطالعہ کریں جو ہسپانیہ کے بعض کتب خانوں مثلاً اسکوریال میں بند پڑے ہیں۔ (خدا جانے اس خوفناک جنگ میں ان نایاب مخطوطوں کو کس قدر

نقصان پہنچا ہو۔)
ڈاکٹر صاحب کو سفر ہسپانیہ میں معلوم ہوا کہ اس ملک میں قومیت اور وطنیت کی ایک نئی لہر دوڑ رہی تھی۔ ملک میں ایسے نوجوان اور فضلا رجل تھے جو ہشت صد سالہ اسلامی حکومت ہسپانیہ کے کارناموں کو فخریہ بیان کرتے تھے اور اس دور کو اندلس کا بہترین زمانہ کہہ کر یاد کرتے تھے۔ اسی تحریک کا نتیجہ تھا کہ مسجد قرطبہ کو کیتھولک چرچ کے مختلف فرقوں سے چھین لیا گیا، حالانکہ کئی سو سال سے ان فرقوں نے مسجد کے مختلف حصوں میں اپنی عبادت گاہیں بنا لی تھیں۔ وطنیت کی اس تحریک کا چونکہ مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا اس لئے مسجد کو محکمہ آثار قدیمہ کے حوالے کر دیا گیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے حکمت الٰہی کی ایک دلچسپ مثال بیان کی کہ مسلمانوں کے اخراج کے بعد جب مسجد قرطبہ (جو تعمیری جمالیات کے لحاظ سے دنیا کی نادر ترین عمارتوں میں سے ہے) عیسائی راہبوں کے قبضے میں آئی تو انہوں نے آیات قرآنی پر جو سنہری حروف میں مسجد کی دیواروں اور محرابوں پر لکھی ہوئی تھیں پلستر کر دیا۔ آج قریباً پانچ چھ سو سال کے بعد جب وہ پلستر محکمہ آثار قدیمہ کے حکم سے اکھاڑا جاتا ہے تو وہی نقوش اپنی پرانی شان میں دنیا کے سامنے آتے ہیں۔ اگر پلستر نہ ہوتا تو یہ نقوش غالباً اس وقت تک بالکل محو ہو جاتے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ فقرہ میرے ذہن میں نقش ہے کہ مسجد اور اس کے نقوش کو دیکھ کر جو لذت قرآن اور اسلام کے مفہوم کے متعلق میں نے حاصل کی، وہ بیسیوں تفسیروں سے حاصل نہ کر سکا۔"

ایک بات ڈاکٹر صاحب کو اسپین کے سفر میں خاص طور سے کھٹکی تھی یعنی کہ اس وقت اس ملک میں پرانی مساجد کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اس کی وجہ جیسی ہو سکتی ہیں، یا مسلمانوں کے ہسپانیہ سے اخراج

کے بعد تعصب کی وجہ سے عیسائیوں نے ان تمام مساجد کو سخت بیدردی سے گرایا ہوگا' اور یا خود مراکشی اندلسی مسلمانوں کو بے ضرورت مساجد تعمیر کرنے کا وہ شوق نہ تھا جو ہندوستانی مسلمانوں کو ہے' پہلا خیال غالباً زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب سپانیہ کی آب و ہوا کی بے حد تعریف کرتے تھے فرماتے تھے کہ اس ملک میں دو تین مقامات ایسے ہیں' اور ان کی فضا اس قدر پاک اور شستہ ہے کہ آج کا پکا ہوا سالن کئی مہینوں تک نہ بگڑے گا۔

(۲۳) دو سال کے قریب ہوئے جب سپین کی موجودہ ملکی جنگ کا آغاز ہوا تو یہ خبریں بھی پہنچنا شروع ہوئیں کہ جنرل فرانکو کی فوج کا زیادہ حصہ' خصوصاً وہ حصہ جو یلغاروں میں اور فیصلہ کن لڑائیوں میں (Storm troops) صف شکنوں کا کام دیتا ہے' تمام تر مراکشی سپاہیوں اور رضاکاروں پر مشتمل ہے۔ کچھ عرصے بعد ان جفاکش اور جری سپاہیوں کی تعداد بھی اخباروں میں چھپنا شروع ہوگئی' ان خبروں سے ہندوستان کے ہر پڑھے لکھے مسلمان پر گہرا اثر ہوا تھا اور ہے' میں نے ایک روز ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں اس خیال کے اثر کا ذکر کیا کہ سرزمین اندلس قریباً (۱۲) سو سال کے بعد پھر مسلمان مراکشی سپاہیوں کے قوی بازوؤں سے سر ہو رہی ہے' ڈاکٹر صاحب فوراً بولے تمہیں میری نظم مسجد قرطبہ کا آخری بند یاد نہیں رہا؟ اس میں میں نے پیشین گوئی کی تھی۔

آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی — دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب!
عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں — میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے — لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

(۲۴) ڈاکٹر صاحب پر جرمن مفکر نطشے کا بہت اثر تھا۔ "خودی" کے اسرار ان پر اس وضاحت اور شدت سے فاش نہ ہوتے' اگر نطشے کی تصانیف سے وہ

ملاحظہ رہے کہ "بالِ جبریل" چھپنے کے کچھ عرصہ بعد ایک دفعہ میں نے اُن سے عرض کیا کہ پچھلے دنوں میں نے نِطشے کی فلاں فلاں کتابوں کو کئی سالوں کے بعد اور شاید تیسری بار پڑھا ہے۔ لیکن اسکی تحریر میں وہ تازگی، جوش اور گہرائی ہے کہ ہر بار معلوم ہوتا ہے کہ پہلی بار پڑھ رہا ہوں۔ اس کے بنیادی خیالات اسلام سے اس قدر قریب ہیں کہ افسوس ہوتا ہے کہ کسی نے اس کے سامنے اسلامی نقطۂ نظر پیش نہ کیا۔ قرآن سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے اسے اپنے فلسفہ میں انکار الوہیت "Godlessness" کی تعلیم دینا پڑی۔ عیسائیت نے خدا کے بیٹے کو "بجری کا میمنا" اور اخلاق کو روحانی پست ہمتی کے مترادف بنا کر اسے صحیح مذہب سے متنفر کر دیا، وغیرہ۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "تمہارا یہ خیال بالکل صحیح ہے، اسی لئے تو میں نے نطشے کے متعلق کہا ہے کہ ع

دلش مومن، دماغش کافر است

ڈاکٹر صاحب کی تصانیف میں شاہین کا تصور درویش ہو نطشے کے زرتشت کے اس وصف سے بہت قریب ہے، جس میں وہ اپنے کوہستانی نشیمن کو اس لئے پسند کرتا ہے کہ وہاں اسے عقاب اور ستاروں کی ہمسائیگی نصیب ہے۔

(۴۰) ڈاکٹر صاحب سے میں نے دو تین موقعوں پر مرزا بیدل کی شاعری کے متعلق پوچھا۔ بیدل کے متعلق اُن کی رائے بہایت اچھی تھی۔ میں نے ایک بار کہا اس کی شاعری میں بے ضرورت مشکل پسندی ہے۔ فرمانے لگے کہ تھوڑی کاوش سے یہ مشکل دور ہو سکتی ہے۔ بیدل نے اپنی خاص اصطلاحات وضع کر رکھی ہیں۔ جنہیں وہ اپنے اشعار میں استعمال کرتا ہے، اگر ان اصطلاحات کو پہلے سمجھ لیا جائے تو بیدل میں مشکل باقی نہیں رہتی۔ بیدل اس قابل ہے کہ اس کا مطالعہ غور سے کیا جائے۔

(۲۶) پچھلے سال اگست یا ستمبر میں ایک روز جب میں شام کے وقت حاضرِ خدمت ہوا تو آپ حسبِ معمول جاوید منزل کے صحن میں بستر پر لیٹے تھے اس سے چند مہینے پہلے ایک دو مرتبہ انہوں نے اپنے بچوں کے لئے ایک معلّم یا اتالیقہ کی ضرورت کا ذکر کیا تھا۔ کچھ دیر سیاسی خبروں کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اس دوران میں ایک یورپی خاتون بچوں کو لیکر گذریں۔ میرے دریافت کرنے پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ یہ خاتون بچوں کی اتالیقہ ہیں جرمن نسل سے ہیں اور نہایت شریف الطبع ہیں۔ انہیں ہر وقت بچوں کی پرورش کا خیال رہتا ہے اور فرصت کا کوئی وقت بھی وہ بیکار نہیں گذارتیں۔ کچھ کام نہ ہو تو کروشیا کا کام شروع کر دیتی ہیں۔ چنانچہ بچوں کی طرف سے تو میری طبیعت اب بالکل مطمئن ہے البتہ مجھے کچھ عرصہ سے تنہائی محسوس ہو رہی ہے۔ علی بخش میری ضروریات کی نگہداشت کرتا ہے لیکن میرے لئے اب زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ صبح سے دوپہر تک کا وقت اچھا گذرتا ہے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ شام کا وقت بھی اسی طرح گذرتا ہے، البتہ دوپہر سے چار بجے تک کا وقت سخت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ پڑھنا بند ہو چکا ہے۔ اور سوئے انسان کب تک۔ میں نے عرض کی کہ موسیقی کا انتظام ہو جائے تو طبیعت کو تسکین رہے گی۔ فرمایا کہ مجھے موسیقی کی بہت خواہش ہے۔ میری طبیعت بھی اس کی طرف مائل ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہندوستانی موسیقی بہت الم انگیز اور پژمردہ ہے۔ جس موسیقی کی مجھے ضرورت ہے، وہ ابھی شروع نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال کہ ہندوستانی موسیقی میں الم کا عنصر بہت غالب ہے اور ذوقِ حیات اس سے پیدا ہو ہی نہیں سکتا، میں نے کئی بار ان کی زبان سے سنا۔ اس نتیجے پر وہ برسوں پہلے پہنچ چکے تھے۔

(۷۴) ۱۹۳۶ء میں جب سر راس مسعود مرحوم کی وفات کی خبر اخباروں میں نکلی اس کے چند روز بعد مجھے ڈاکٹر صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ مجھے معلوم تھا کہ مرحوم ان کو بہت عزیز تھے چنانچہ جب میں نے ان کی خدمت میں اظہار افسوس کیا تو انھوں نے مرحوم کی بہت تعریف کی۔ میں نے پوچھا کہ مرحوم میں خاص خوبیاں کیا تھیں فرمانے لگے کہ دو باتیں ان میں نمایاں تھیں۔ ایک یہ کہ وہ بجد فیاض تھے ہر کسی کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ کسی کی تنگ دستی کو برداشت نہ کر سکتے تھے اسی لئے ان کی تنخواہ (اگرچہ معقول تھی) ان کے لئے کافی نہ تھی۔ کوئی سائل ان کے گھر سے خالی نہ جاتا تھا۔ میں تمھیں ایک مثال دیتا ہوں۔ ....

.... ان کی بیماری سے کچھ عرصہ پہلے میں نے انھیں لکھا کہ میں نے اپنی وصیت میں چار اشخاص کو اپنے بچوں کا سربراہ مقرر کیا تھا۔ ان میں سے ایک صاحب فوت ہو گئے ہیں مجھے بہت خوشی ہوگی اگر آپ سربراہ بننا منظور فرمائیں۔ انھوں نے جواب میں لکھا کہ میں لاہور سے بہت دور ہوں اس لئے بحیثیت سربراہ میں بچوں کو کیا فائدہ پہنچا سکوں گا۔ البتہ آپ براہ مہربانی اپنی وصیت میں یہ الفاظ ضرور درج فرمائیں کہ اگر بچوں کو خدانخواستہ کبھی مالی تکلیف ہو تو سب سے پہلے اطلاع کا حقدار مجھے سمجھا جائے۔ دوسری نمایاں خصوصیت مرحوم میں یہ تھی کہ ان کا دسترخوان بہت فراخ تھا اور ان کا کھانا بہترین۔ ان کے پاس بہترین باورچی ملازم تھے اور ہندوستانی کھانوں اور ضیافتوں پر وہ بے دریغ خرچ کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اسی غرض سے خالص عربی میزبانی کا سامان مکمل جمع کیا تھا۔ الغرض مرحوم ہندوستان کے خوش وضع اور معزز اکابر میں سے تھے اب ان کا جانشین یا ثانی مشکل سے ملے گا۔

(۷۵) ڈاکٹر صاحب سے میری آخری ملاقات اخیر دسمبر ۱۹۳۷ء میں ہوئی اس وقت وہ خوابگاہ میں پلنگ پر بیٹھے تھے۔ کچھ دیر تک مری باتیں ہوتی رہیں پھر

علی بخش نے آکر اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے (دوپہر کا وقت تھا) فرمانے لگے "چلو دوسرے کمرے میں بیٹھیں۔" ڈاکٹر صاحب صوفہ پر بیٹھ گئے۔ علی بخش نے کرسی سامنے رکھ دی اور کھانا اس پر چن دیا۔ میں کھانا کھا چکا تھا۔ اس لئے قریب ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ آپ آہستہ آہستہ کھانا کھاتے رہے۔ اور باتیں بھی ہوتی رہیں۔ اتنے میں رفیق (دوسرا ملازم) اندر آیا۔ اور اطلاع دی کہ مسٹر یوسف علی اور چھوٹے میاں (نواب سر ذوالفقار علی خاں صاحب مرحوم کے صاحبزادے) آئے ہیں۔ آپ نے فرمایا "یہیں بلاؤ" چنانچہ کرسیاں قریب ہی رکھ دی گئیں۔ اور دونوں صاحب اندر تشریف لائے۔ مسٹر یوسف علی نے سلام علیک کے بعد مزاج پرسی کی۔ ڈاکٹر صاحب نے حسب عادت فرمایا "بہت اچھا ہوں" مسٹر یوسف علی نے فرمایا "میرا بھی یہی خیال ہے۔ کیونکہ کھانا کھانا خود صحت کی نشانی ہے۔" ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا "آپ انگلستان سے کیسے آمد ہوئی" یوسف علی صاحب نے جواب دیا کہ قرآن کریم کے آخری تین پاروں کا ترجمہ زیر طبع ہے۔ یہ کام اپنی نگرانی میں کروانے کیلئے آیا ہوں۔ کسی بات پر آپ نے مسٹر یوسف علی کو ایک لطیفہ سنایا۔ (جو میں بھول گیا)۔ اس میں دو بیویوں کی "سوت" کا ذکر تھا۔ میں مسٹر یوسف علی کے سامنے بیٹھا تھا۔ لیکن غالباً وہ مجھے پوری طرح پہچان نہ سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان سے کہا "آپ پروفیسر حمید کو پہچانتے ہیں؟ اسلامیہ کالج میں دو سال آپ کے ماتحت کام کیا ہے ہیں۔" مسٹر یوسف علی بولے "ہاں" ہاں بعد میں تمھیں گجرات میں بھی تو دیکھا تھا۔ لیکن ابھی تم نے اپنے بال کیوں اس قدر سفید کر لئے ہیں؟ میں نے عرض کی کہ خاندانی رجحان سفید بالوں کی طرف زیادہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے مسٹر یوسف علی کی طرف مڑ کر کہا "آپ کی صحت پہلے سے بہت اچھی ہے" وہ بولے "پہلے (اسلامیہ کالج میں) میں غلام تھا۔ آجکل آزاد [illegible]

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "نہیں ابلکہ بات یہ ہے کہ ان کے لئے (میری طرف اشارہ کرکے) زمان (Time) کی رونگے کی طرف بہ رہی ہے اور آپ کے لئے پیچھے کی طرف

Time is moving forwards for the professer and back wards for you

اس کے بعد حسب ذیل باتیں ہوئیں :-

یوسف علی صاحب فرمایئے آجکل کچھ زیر تصنیف ہے

ڈاکٹر صاحب ۔ اردو اور فارسی دونوں میں کچھ کلام جمع ہو رہا ہے۔

یوسف علی صاحب آپ کو میرے ساتھ وہ وعدہ یاد ہے کہ آئندہ فارسی چھوڑ کر اردو کی طرف دوبارہ متوجہ ہوں گا۔

میں دو بانگ درا کے بعد ڈاکٹر صاحب کی دو اور کتابیں اردو میں شائع ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب ۔ جی ہاں میں اردو میں چند سالوں سے لکھ رہا ہوں۔

یوسف علی صاحب ۔ موجودہ تصنیف کب مکمل ہوگی ؟

ڈاکٹر صاحب ۔ اگلے سال انشاء اللہ مدینہ منورہ میں پہنچ کر۔

یوسف علی صاحب ۔ آئندہ سال حج کو ضرور تشریف لے جایئے گا ؟

ڈاکٹر صاحب جی ہاں ارادہ تو یہی ہے۔ اطالوی کونسل جنرل نے مجھے دعوت دی ہے کہ اطالوی کمپنی لائیڈ ٹریسٹینو کے کسی جہاز میں سفر کیجئے گا۔ جہاز جدہ میں تو نہیں ٹھہرتے لیکن جدہ کے سامنے اطالوی شمالی بندرگاہ پر ٹھہرتے ہیں۔ وہاں سے وہ میرے لئے ایک خاص دخانی بوٹ کا انتظام کرنے کا وعدہ کرتے ہیں جو مجھے جدہ پہنچا دے گی اس طرح سفر میں مجھے تکلیف نہ ہوگی۔ اس کے متعلق خط و کتابت جاری ہے۔

یوسف علی صاحب:- بے شک اطالوی حکومت کو اسلامی دنیا میں آپکی اہمیت کا پورا علم ہوگا' اور وہ ہر طرح سے آپ کو سہولت پہنچانیکی کوشش کرے گی۔

ڈاکٹر صاحب:- میں بھی جانتا ہوں کہ سفر کی کوفت سے بچوں۔ صحت کی موجودہ حالت میں اس کوفت کو برداشت نہ کر سکوں گا۔

چند منٹ اور گفتگو ہوئی اس کے بعد دونوں صاحب تشریف لے گئے۔ اس ملاقات سے پہلے بھی ایک دو بار مجھ سے ڈاکٹر صاحب نے سفرِ حجاز کے متعلق اس تجویز کا ذکر کیا تھا۔ انھیں حج کی اس قدر تمنا تھی کہ غالباً انتقال کے وقت انھیں اسی ایک آرزو کے پورا نہ ہونے کا رنج رہا ہوگا۔

دس پندرہ منٹ کے بعد میں بھی اجازت لے کر رخصت ہوا۔ اس وقت میرے دل میں یہ خیال ہرگز نہ آسکتا تھا کہ چار مہینے کے قلیل عرصے میں ڈاکٹر صاحب اپنے عقیدت مندوں کو داغ مفارقت دے جائیں گے۔ اس وقت ان کے چہرہ سے صحت ٹپک رہی تھی۔ خط تھوڑی دیر پہلے بنوا کر بیٹھے تھے۔ مونچھوں کو قدرے تاؤ بھی دے رکھا تھا۔ چہرہ کی شان جرمن جرنیلوں کی سی تھی۔ طبیعت بہت بشاش تھی۔ مسرت ذوق تھی۔ صرف تکلیف تھی ایک آواز جو کسی طرح کھلتی نہ تھی۔ اور دوسرے موتیا بند جو کچھ عرصے سے اتر آیا تھا۔ آواز کے نہ کھلنے کا انھوں نے کبھی گلہ نہ کیا تھا۔ اور موتیا بند کا وہ مارچ ۱۹۳۸ء میں آپریشن کرانا چاہتے تھے۔ انکی شکل و ہیئت سے کوئی ایسے آثار ظاہر نہ تھے جن سے میرے یا اور کسی شخص کے دل میں وہم پیدا ہو کہ خودی کا یہ دانائے راز سفرِ آخرت کے لیے تیار بیٹھا ہے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

اسلم جیراجپوری

یومِ اقبال

گزشتہ زمانوں میں بالعموم اہلِ کمال کو ان کے کمال کی داد ان کی زندگیوں میں نہیں ملتی تھی بلکہ مرنے کے بعد جبکہ وہ اس دنیا کو چھوڑ کر چلے جاتے ان کا نام روشن ہوتا تھا۔ عرفی نے اسی کا ماتم کرتے ہوئے کہا ہے۔

چہ دل کشا بود از پی کہ بعد از من گویند — کہ بودہ است فلاں دام ہمہ استاد
از آنکہ بعد بریدن تمام شانہ شود — گرہ کشادہ نگردد ز طرۂ شمشاد

لیکن آج ذرائع الحاق و اتصال اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ ساری دنیا بمنزلہ ایک گھر کے ہو گئی ہے اور جو کمال کسی میں ہوتا ہے فوراً ہی لوگ اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سر اقبال کے اشعار کی محبوبیت اور مقبولیت نہ صرف ہندوستان بلکہ غیر ممالک تک بھی پہنچ چکی ہے اور ہر پڑھے لکھے مسلمان کے دل میں ان کی عزت اور عظمت جاگزیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "دی انٹر کالجیٹ مسلم برادر ہوڈ" نے اس سال کے آغاز میں ۹ جنوری کو "اقبال ڈے" منانے کا فیصلہ کیا تاکہ دنیائے اسلام کے اس عظیم الشان شاعر کے حضور میں وہ اپنی طرف سے

عقیدت کا نذرانہ اور تحسین کا خراج پیش کرے۔ ان طلبہ نے مجھے بھی اس جلسے میں مدعو کیا اور نہایت اصرار کے ساتھ۔ اس لئے میں ۹ جنوری کو دہلی سے لاہور پہنچا دن صرف ایک تھا اور پڑھنے والے۔ بولنے والے۔ نظمیں اور مضامین سنانے والے بہت سے تقریباً تین سو کی تعداد میں۔ اس وجہ سے پروگرام بہت طویل ہو گیا تھا اور تین تین گھنٹے کی تین نشستیں صبح ½۹ بجے سے رات کے ½۹ بجے تک رکھی گئی تھیں۔ پہلی نشست میں مسٹر گوپی چند نارنگ صدرِ جلسہ تھے۔ ہمارا دہلوی قافلہ ذرا دیر سے پہنچا تھا اس لئے ہم اس نشست کے آخر میں شریک ہوئے اور بعض مقالات اور نظمیں سننے سے محروم رہے۔ دوسری نشست ڈیڑھ بجے زیرِ صدارت مسٹر شیخ عبدالقادر صاحب ممبر انڈیا کونسل منعقد ہوئی اس میں متعدد مقالے نہایت عمدہ تھے خاص کر خواجہ غلام السیدین صاحب ایم اے ایل ٹی پرنسپل ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا انگریزی مقالہ بہت گراں قدر تھا۔ مولانا عابد علی صاحب عابد ایم اے کی تحریر بھی نہایت دلچسپ تھی۔ اور حفیظ جالندھری کی شاعری اور موسیقی دونوں داد کے قابل تھیں نیز صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم ایم اے نے اقبال کی شاعرانہ حیثیت کو کامیابی کے ساتھ نمایاں کیا تھا۔

تیسری نشست جو ½۵ بجے شام کو شروع ہوئی اس میں علامہ عبداللہ یوسف علی صدر تھے۔ اسی نشست میں بیگم شاہنواز نے ایک مختصر تقریر فرمائی اور اعلان کیا کہ ان کے شوہر نے دس مربعے زمین ڈاکٹر اقبال کے چھوٹے بیٹے جاوید کے نام ہی اقبال ڈے کے سلسلے میں منتقل کر دی ہے۔ اس اعلان نے اس یادگار کو ایک مادی قوت بخشی اور حاضرین نے اس پر نہایت خوشی اور شکریہ کا اظہار کیا۔ اس کے بعد علامہ عبداللہ یوسف علی نے اپنی جگہ پر مجھ کو

بٹھا دیا اور خود چلے گئے۔ پروفیسر محمد عمر فاروق ایم اے اور پروفیسر عزیز اللہ صاحب ایم ایس سی نے انگریزی زبان میں کچھ مفید مقالے پڑھے۔ کئی نظمیں بھی پڑھی گئیں جن میں سے مولانا اسد ملتانی کی نظم خصوصیت کے ساتھ دلچسپی سے سنی گئی۔ آخر میں چودھری غلام احمد صاحب پرویز نے اپنی تقریر "اقبال اور قرآن" پر شروع کی۔ جو اس قدر پسند کی گئی کہ خاتمہ کے وقت بار بار لوگ درخواست کرتے تھے کہ کچھ اور اضافہ کیجیے۔ مگر چونکہ وقت زیادہ گزر چکا تھا اس لیے میں نے جلسہ کو ختم کر دیا اور حسب ذیل تقریر کی۔

"ڈاکٹر اقبال کے کلام کا میں اس وقت سے مسلسل مطالعہ کر رہا ہوں جبکہ آج سے ایک قبل صدی پیشتر شیخ عبدالقادر کا رسالہ "مخزن" لاہور سے نکلتا تھا جس میں ان کی نظمیں چھپا کرتی تھیں۔ زمانۂ مابعد میں ڈاکٹر صاحب کی مثنویوں اسرار خودی و رموز بیخودی اور پیام مشرق نیز جاوید نامہ وغیرہ پر میں نے تبصرے بھی لکھے جو ملک کے ممتاز رسالوں میں شائع ہوئے ڈاکٹر صاحب کے کلام کے ساتھ میری دلچسپی اور گرویدگی کی خاص وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری سے شعر اور ادب کی جس قدر خدمت کی ہے اس سے کہیں زیادہ اسلام اور قرآن کی خدمت کی ہے۔

ادھر صدیوں سے مسلمانان ہند کی حالت یہ ہو گئی ہے کہ قرآن سے اُن کو لگاؤ نہیں رہا ہے اور ان کا دینی تصور اس کی تعلیمات سے قوی تر ہوا ہے۔ وہ صرف ان خیالات کے پیرو ہیں جو سراسر انسانی ہیں جن کو ملاؤں نے فرقہ بندی

اور باہمی افتراق کا ذریعہ بنا کر ملت کے اجتماعی شیرازہ کو بیا درہم برہم کر رکھا ہے کہ جدید تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کے دلوں میں ان کی حالت دیکھ کر خود اسلام اور قرآن کی طرف سے بے اعتنائی بلکہ بدگمانی پیدا ہو گئی جو اس صورت میں ہر عقلمند اور صاحب فہم کے دل میں پیدا ہونی چاہیے تھی۔ ایسی حالت میں ڈاکٹر اقبال نے جو خود تعلیم جدید کے ایک درخشندہ آفتاب ہیں اپنی خداداد قابلیت اور اندرونی روشنی سے شاعری کے ساز پر وہ دینیات کا راگ چھیڑا جس سے مسلم نوجوانوں کے افسردہ دلوں میں قرآن کی محبت کی آگ بھڑک اٹھی اور انھوں نے اس کی عظمت اور اسلام کی حقیقت کو پہچانا۔

بھٹکے ہوئے راستے کی طرف قوموں کو مائل کرنا اور ان کے دلوں کو ہدایت کی طرف موڑنا وہ کام ہے جس کیلئے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل گزشتہ زمانوں میں انبیائے کرام آیا کرتے تھے وہی کام قدرت نے اکبر صاحب اور ڈاکٹر صاحب نے اپنی شاعری سے لیا۔ مولانا گرامی مرحوم کا یہ قول کس قدر صحیح ہے۔

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

دوسری طرف ہماری شاعری بجائے خود اتنی مہمل ہو گئی ہے کہ اس کے تمام رشتے حیات اور عمل سے مدت ہائے دراز سے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ شعراء خود نہیں سمجھتے کہ وہ کس ہذیان میں مبتلا ہیں اور کس لئے مبتلا ہیں۔ بس ایک پرانی لکیر ہے جس کو پیٹے

چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ اس صدی کے نامور شاعر اور قوم کے رہبر مولانا حالی مرحوم نے کہا ہے

وہ شعر و قصائد کا ناپاک دفتر — عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
ملک جس سے شرماتے ہیں فوق سماک — زمیں جس سے ہے زلزلہ میں برابر

وہ علموں میں علم ادب ہے ہمارا
ہوا علم دیں جس سے تاراج سارا

ڈاکٹر اقبال نے اسی عامیانہ بدذوقی کی دنیا میں اپنی شاعری کا رشتہ زندگی اور بالخصوص اسلامی اور قرآنی زندگی کے ساتھ قائم کیا۔ یہ وہ چیز ہے جس کے لئے توفیق الٰہی اپنے کسی خاص ہی بندے کو چنتی ہے۔ چنانچہ آج بھی جب کہ ان کے کلام کا اتنا نمونہ ہمارے شعراء کے سامنے موجود ہے کوئی ان کی نکالی ہوئی شاہراہ پر چلنے کے قابل نہ ہو سکا۔ بعضوں نے صرف لفظی نقالی کی کوشش کی مگر زندگی کی ان برقی لہروں کو نہیں دیکھ سکے جو ڈاکٹر صاحب کے شعروں کی رگ رگ میں دوڑ رہی ہیں۔

اسلامی زبانوں میں سے کم سے کم تین زبانوں عربی، فارسی اور اردو کے اکثر بڑے بڑے شعراء کے کلام کا میں نے غور اور دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال کے اشعار ایسے دلکش امیدوں سے ایسے بھرے ہوئے اور اسلامی حقائق سے اتنے لبریز ہیں کہ میں ان کو اسلام کا سب سے بڑا شاعر ماننے پر مجبور ہوں۔ اس انتہائی زوال اور ذہنی پستی کے زمانہ میں مسلمانانِ ہند کے لئے ان کا کلام قدرت کی طرف سے ایک

موہبت کبریٰ ہے جس نے نوجوانوں کی جدید دماغی تعمیر میں بہت بڑا حصہ لیا ہے اور آئندہ کیلئے وہ جانا نہ صرف ادبی بلکہ ملی شرف ہے۔"

ہر چند کہ یہ پہلا اقبال ڈے تھا اور طلبہ کی طرف سے تھا ان کے ابتدائی کاموں میں لازمی طور پر خامیاں ہوتی ہیں لیکن بحیثیت مجموعی نہایت کامیاب رہا۔ مولانا عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو۔ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب پی ایچ ڈی پروفیسر جامعہ ملیہ اور ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب پی ایچ ڈی۔ پروفیسر جامعہ عثمانیہ کے آنے کی بھی خبر تھی اور ان میں سے سوائے مولانا عبدالحق صاحب کے سب کے نام بھی پروگرام میں درج تھے لیکن یہ حضرات اپنی مجبوریوں کی وجہ سے نہ آسکے ورنہ اقبال ڈے اور بھی زیادہ کامیاب رہتا۔

دوسرے دن ہم ڈاکٹر اقبال سے ملے جو ہمارے منتظر تھے۔ ۹ بجے سے سلسلہ گفتگو ساڑھے بارہ بجے تک رہا۔ امسال حج کی شرکت کا ارادہ رکھتے تھے مگر بیماری اور کمزوری کی حالت یہ ہے کہ کوٹھی سے باہر نکلنا مشکل ہے کہتے تھے کہ میں تو دو سال سے ارادتاً سفر حج میں ہوں عملاً جب موقع اللہ دے۔ بلکہ وہ اشعار بھی لکھ لئے ہیں جو اس سفر سے متعلق ہیں۔ ان میں سے کہیں کہیں سے مجھے سنایا بھی۔ مکہ سے مدینہ کی روانگی کے وقت ایک غزل لکھی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کو مخاطب کرکے کہتے ہیں۔

تو باش اینجا و با خاصان بیامیز که من دارم ہوائے منزل دوست

یہ شعر سناتے ہی گریہ ایسا گلوگیر ہوا کہ آواز بند ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ مجھے یہ دیکھ کر مجبوراً موضوع سخن بدلنا پڑا۔

پروفیسر محمد مجیب
بی اے ۔ آکسن

ڈاکٹر اقبال

ڈاکٹر اقبال مرحوم سے ملاقات کا شرف مجھے مارچ ۱۹۲۳ء میں حاصل ہوا اس زمانے میں جرمنی میں پریس کا کاروبار کرتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم پیام مشرق کا نیا اڈیشن چھپوانا چاہتے تھے اور ایک دوست شیخ نذیر نیازی صاحب نے میرا تعارف اور میرے پریس کی سفارش کرنے کا وعدہ کیا تو میں نے موقع کو غنیمت جانا اور لاہور چلا گیا۔ اس وقت میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کا مکان میکلوڈ روڈ پر تھا۔ ویسے تو بنگلہ کا پھاٹک بھی تھا اور اپنی الگ سڑک بھی تھی لیکن پھاٹک چند ٹوٹی پھوٹی کوٹھریوں کے قبضے میں تھا اور اس پر جو بورڈ لگا تھا اس پر نہ زمین کی سیاہی باقی رہی تھی نہ حروف کی سفیدی، بس زنگ اور گرد کے بڑے بڑے دھبے سے تھے، اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کے سوا اور کسی کو ہمت نہ ہو سکتی تھی کہ ایسے بورڈ کو اپنے پھاٹک پر لگا رہنے دے۔ پھاٹک کے اندر احاطہ خاصا بڑا تھا لیکن وہاں پہنچتے ہی ڈاکٹر صاحب مرحوم کے دیدار کے خیال نے نظر کو ادھر ادھر دوڑنے نہ دیا۔ میرے دوست نے ڈاکٹر صاحب کے ملازم علی بخش کو بلایا، وہ ایک طرف سے دوڑتا ہوا آیا اور ہم

آواز کا جواب خود ڈاکٹر صاحب نے دیا۔

"آؤ بھی نیازی صاحب"

ہم دونوں جلدی سے زینوں چڑھ کر آنگن میں پہنچے جہاں تعارف کرایا گیا اور میں ادب سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے نیازی سے بڑی محبت و اپنائیت او بے تکلفی سے باتیں شروع کر دیں۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ حسن و عشق کے ذکر کا نہیں تو ردیف اور قافیہ اور بحر کے ترنم کا اثر شاعر کی صورت پر پڑتا ہے اور صورت میں کوئی غیر معمولی بات نہ ہو تو ادا، انداز، آنکھوں کی چمک، ہونٹوں کی لرزش، کچھ نہ کوئی خصوصیت نظم کہنے والے کو ان لوگوں سے ممتاز کر دیتی ہے جو نثر سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اسی وجہ سے یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی تھی کہ ڈاکٹر اقبال کی صورت شکل، وضع قطع، لباس اور گفتگو میں ان کی شاعرانہ عظمت کا پتہ دینے والی کوئی صفت نہیں۔ میں اس غلط فہمی میں مبتلا تھا اور پہلی نظر نے اسے اور بڑھا بھی دیا۔ میلی قمیص، شلوار، بے سلی نہ صاف، بال شیانے کھچڑی رنگ کے، مونچھیں حجام نے جیسے سمجھ میں آیا کاٹ دیا تھا، رنگت بے آب، آنکھیں دھوپ میں بیٹھے رہنے سے دبی اور دھنسی ہوئی مونچھیں پتلی اور آگے کو نکلی ہوئیں، دہانہ چوڑا اور اس کے دونوں طرف گہری جھریاں، اس پر زبان بھی جیسی اردو اور پنجابی۔ یہ شاعر کا سراپا نہ کہلائے گا اور در اصل یہ ڈاکٹر صاحب کی اصل صورت بھی نہیں۔ میلا شلوار اور قمیص کی طرح روزمرہ کی صورت جو ایک پردہ کی طرح اوپر چڑھی رہتی تھی اور ان کی اصل صورت کو روزمرہ کے گرد و غبار اور اس میل سے بچائے رکھتی جو سبھی کے جسم پر جما کرتا ہے۔ یہ اوپر کا پردہ ادھر ادھر کی دو چار باتیں کرنے کے بعد ہی اٹھ گیا جب ڈاکٹر صاحب نے مسلمانوں کی موجودہ حالت پر گفتگو شروع کی۔ وہ تخیل اور ذہانت کی ایسی تیزی سے

پڑا رہتے ہیں جو تعلیم یافتہ مسلمانوں کو صنعت اور کاروبار سائنس اور تجارت کے میدانوں میں ثابت قدم رکھنے سے روکتی ہے اور انہیں تاریخ اور ادب کی کتابیں چاٹنے کے سوا اور کسی لائق نہیں چھوڑتی ڈاکٹر صاحب کو یہ بات بہت پسند آئی کہ میں جرمنی جا کر ریسرچ کا کام سیکھا تھا اور ان کی ہمت افزائی نے مجھے بھی اس کا موقع دیا کہ میرے دل میں ان کی جو عزت اور محبت تھی اسے ظاہر کر دوں۔ پھر اگلے وقتوں کی باتیں چھیڑیں۔ مسلمانوں کا حال تو آپ جانتے ہیں، تاریخ ان کے مکان کی چھت ہے اور وہ ہر وقت اس فکر میں رہتے ہیں کہ دیواریں کہیں اتنی کمزور نہ ہو جائیں کہ چھت کا بوجھ نہ سنبھال سکیں کہیں ان کے سر سے جا پہ نہ اٹھ جائے، ان کا گھر ویران نہ ہو جائے۔ اگلے وقتوں کی باتیں چھیڑیں تو ڈاکٹر صاحب کی صورت کے دوسرا پہرہ دو پہنا۔

ظاہر میں تو وہی ڈاکٹر اقبال اسی لباس میں اسی کرسی پر دھوپ میں بیٹھے حقے کے کش پر کش لے رہے تھے، لیکن ان کی باتیں سنتے سنتے کبھی تو اس کتب خانہ کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی تھی جہاں علم کا سارا ذخیرہ جمع ہو جاتا، عالم اور شاعر اور فقیہ مل کر بیٹھے ہوں، ان کے دل میں ایک خیال، زبان پر ایک بات، آنکھ میں ایک نشہ ہو۔ اور ان کی صحبت نے ایک فضا پیدا کر دی ہو جو آدمی کی رگ و پے میں سرایت کر جائے اور اس کے دل میں وہی ایک خیال ہو جائے، زبان سے وہی ایک بات نکلے، آنکھ بھی ایک نشے میں مست ہو جائے، کبھی نے عالم ہو شاعر اور فقیہ کی تین ہستیوں کو ایک شخصیت بنا دیا تھا کبھی نظر ہر قید سے آزاد ہو جاتی تھی۔ مشرق سے مغرب تک دنیا ایک قالین کی طرح بچھ جاتی تھی، اور دنیا کا وہ کاروبار جو تخیل کو عاجز کر دیتا ہے، آنکھ سے دکھائی دینے لگتا کبھی جہالت کی تاریکی علم کی روشنی سے چھٹتی، جو تخیل کی گرہ شوق کے ہاتھوں کھلتی

کبھی علم اور شوق کی پیاس جذبۂ دین کے ابلتے چشموں میں بجھتی، کبھی منزل کی دوری ہمت کو توڑ دیتی، کبھی منزل پر پہونچ کر انسان زمین آسمان پر اس طرح نظر ڈالتا ہوا دکھائی دیتا جیسے کسان اپنی زمین کو دیکھتا ہے۔ اس وقت بھی ڈاکٹر اقبال اسی لہجے میں، اسی انداز سے باتیں کر رہے تھے، لیکن میرا سر جھکتا جا رہا تھا، آنکھیں کھلتی جا رہی تھیں۔

یہ دوسرا پردہ نہیں ہٹا۔ اس کے آگے میں اور کچھ نہیں دیکھ سکا۔ اس کے آگے اور کوئی بھی جا نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ وہاں ڈاکٹر اقبال کی خلوت تھی۔ جس کا ایک ہی دروازہ تھا اور وہ آسمان کی طرف کھلتا تھا۔

اس پہلی ملاقات کے بعد میں دو تین روز کے اندر کئی مرتبہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ ان کے یہاں صبح سے شام تک ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ دو ایک بار میں ایسے وقت بھی گیا جب وہاں اور لوگ بھی بیٹھے تھے اور ان سے ڈاکٹر اقبال کی جو گفتگو ہوتی تھی وہ بھی میں نے سنی۔ پھر میری سمجھ میں آ گیا کہ ڈاکٹر صاحب اپنی شخصیت کو تہ در تہ کیوں رکھتے ہیں، لاہور کے شہری بن کر کیوں رہتے ہیں، ملت اسلامی کا آفتاب ہوتے ہوئے بادلوں کے نقاب کیوں ڈالے رہتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بے پروائی جو شاعرانہ مزاج کے لوگ بکھرے بالوں اور بے ڈھنگے کپڑوں سے ظاہر کرتے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے اس طرح سے برتی کہ اپنے آپ کو ہر امتیاز سے محروم کر دیا۔ وہ خوش مذاقی جو دوسرے اچھے کپڑوں، سلیقے کے رہن سہن، نفاست اور تکلفات میں تلاش کرتے ہیں، انھیں ملنساری، وہ ہنسی مذاق اور دریائی پرند کی طرح پانی میں رہ کر پر و بازو کو خشک رکھنے کی صفت میں ملی۔ مختصر یہ کہ انھوں نے اس اونچی وضعداری کو نظر انداز کیا جس کی رسائی لباس

اور آدابِ صحبت کے آگے نہیں، اور اس اعلیٰ وضعداری کو اختیار کیا جو سمجھدار ہیں جہان کو تھام رکھتی ہے یا زمین آسمان کی گردش میں قطب کے ستارے کو۔ وہ دنیا میں دنیا والوں کی طرح رہتے تھے، دل میں صاحب دلوں کی طرح گفتگو جلوت میں کرتے تھے، شعر خلوت میں کہتے تھے، وہ خود بالکل سچ فرما گئے ہیں کہ ؎

باچنیں زورِ جنوں پاسِ گریباں داشتم
در جنوں از خود نہ رفتن کارِ ہر دیوانہ نیست

جنون کے اس زور میں بھی میرا گریباں کبھی چاک نہ ہوا، یہ ہر دیوانے کے بس کی بات نہیں کہ جنون میں بھی آپے سے باہر نہ ہو۔

ان کی ظاہری صورت دراصل ضبط کا ایک پردہ تھا، اور اس میں خوبی یہی کہ یہ وہ قدرتی تھا جیسے ہیرے کے لئے پہاڑ کا آنچل، موتی کے لئے سیپ کا سینہ ہوا کرتا ہے۔

یہ سوچ کر مجھے اور بھی تعجب ہوتا ہے کہ ایسے لوگ جن کے دل میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کی بڑی قدر تھی، یہ شکایت کرتے تھے کہ ان سے مل کر وہ اس طرح محظوظ نہ ہوئے جیسا کہ ان کا کلام پڑھ کر محظوظ ہوتے تھے۔ ڈاکٹر اقبال کی صحبت میں بیٹھ کر ہر شخص ان کا جلوہ دیکھ سکتا تھا۔ ڈاکٹر اقبال نہ بتے یا ان کا جلوہ نہ دیکھتا۔ ان کی صحبت دراصل صحبت میں بیٹھنے والوں کا امتحان تھا، وہاں جاکر دوسرے یہ اندازہ کرسکتے تھے کہ ڈاکٹر اقبال کتنے بڑے آدمی ہیں۔ ڈاکٹر اقبال خود یہ اندازہ کرلیتے تھے کہ ملنے والا کس ذہنیت اور کس مذاق کا آدمی ہے، اور اسی کے لحاظ سے گفتگو ہوتی۔ ڈاکٹر اقبال کے اپنے ذہن میں بڑی اونچ تھی اور وہ عقاب کی طرح بلندی کے پابند تھے، نہ جہاں اور آدمی پہنچ

پستی میں گرفتار رہتے۔ شاعر کا کلام اس کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال اپنی نظموں میں اپنے متعلق جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے تھے۔ اب یہ ان کے قدردانوں کا فرض تھا کہ اُن کی شخصیت کو سمجھیں، اس سے اثر لیں، اور روزمرہ زندگی میں ایسی باتوں کے چرچے کریں جو ڈاکٹر اقبال کے دل اور ان کے کلام میں رچے تھے۔

لیکن ایسا نہیں ہوا .... اور اس کا دکھ سب سے زیادہ خود ڈاکٹر صاحب کو تھا۔ اُن کی مایوسی کا جو عالم تھا وہ اُن کی ان بے شمار نظموں سے ظاہر ہوتا ہے جن میں انھوں نے اپنی بے قدری اور تنہائی کی کیفیت بیان کی ہے اور اسی کی پرچھائیں ہی، میں ایک مرتبہ ان کے چہرے پر دیکھ بھی چکا ہوں۔ لوگوں نے انھیں سیاست میں اُلجھایا، ان کی بات نہیں سمجھے، اُن کی زبان سے اپنی بات کہلوانے کی فکر میں لگے رہے۔ اُن کی بڑی غرض کو اپنی حقیر غرض کا روپ دے کر اسے رسوا کیا، ان کے بڑے کام کے بہانے سے اپنا چھوٹا کام نکال کر انھیں اور ساری دنیا کو دھوکا دیا۔ جنھوں نے یہ نہیں کیا وہ بھی عمل کا کام کر کے دکھانے کا، تحریکیں اٹھانے کا شور مچاتے رہے۔ ڈاکٹر اقبال سے مطالبہ کرتے رہے کہ اپنی آنکھیں بند اور دل خاموش کر کے ان میں آ کر مل جائیں۔ آ جانے سے فائدہ نہ اٹھایا، آخر کو اپنے پاس بلاتے رہے۔

ڈاکٹر اقبال کا بڑا دل چھوٹے کاموں میں لگ ہی نہ سکتا تھا، اور کوئی اپنا نہ ملنے سے ان کا دل بیزار، کام کر بھی گیا۔ جس شخصیت کا وہ خواب دیکھتے تھے اس کے اور ان کے درمیان جس مرتبے کا فرق تھا جس عمل کو وہ سچا عمل سمجھتے تھے وہ غور کیجیے تو ان کے اپنے کارناموں کا بس دوسرا رخ ہے۔

انھوں نے اپنے اندر وہ یقین پیدا کر لیا تھا جو دنیا میں ایمان پھیلاتا ہے اور زندگی کا سارا بوجھ سنبھالتا ہے اور ان کے ذہن میں انسانیت کا جو تصور تھا وہ رہا ہے جس نے دنیا کو بارہا ایک نئی دنیا بنا دیا ہے اور ان کے کلام میں ایک نئی دنیا بنائی گئی بھی ہے۔ انھوں نے جتنے جدید تجربے لیے تھے جو یقین کی جان اور انسانیت کی آبرو ہیں اور ان میں وہ صفت پائی جاتی تھی جو سچے یقین یعنی انسانیت جیسے عمل کی پہچان ہے یعنی ایک پوری ملت کے تمام گہرے اور مستقل اور زندگی کو شکل و صورت دینے والے جذبات سمٹ کر ان کے دل میں آ گئے تھے اور انھیں ایک موثر بنا دیا تھا کہ جسے دیکھ کر تاریخ کہتی ہے کہ ہاں صحیح ہے۔ مذہب کہتا ہے کہ ان ہی چاہیے اور ہر زمانے کے لوگ کہتے ہیں کہ ہماری آرزو ہے کہ ہم بھی ایسے ہو جائیں۔ سچی شخصیتیں سمندر کی کشتیوں کی طرح چاہتی ہیں کہ اختیار کا لنگر ہو، عزم و دل جو تیزی کا بادبان ہو، قومی جذبات کی ہوا موافق ہو اور چلتی رہے، سستانے اور پناہ لینے کے لیے ذاتی زندگی اور معاملات کا ساحل قریب ہے تب کہیں وہ اپنی چال دکھا سکتی ہیں اور منزل تک پہنچانے کا حوصلہ کر سکتی ہیں۔ وہ موج تو تیزی اور جوش ہے جو سمندر کی تھاہ لیتی ہے کہ گہرائی کافی ہے یا نہیں، ہوا کو للکارتی ہے کہ دم ہو تو ذرا اپنا زور دکھا، آسمان سے کہتی ہے کہ ذرا اونچا ہو سکتا ہو تو ہو جا، اسے ساحل سے عداوت ہوتی ہے، وہ آپ اپنی منزل ہوتی ہے اسے کہیں جانا نہیں ہوتا، اس کے لیے اٹھنا اور تڑپنا ہی ہے۔ ڈاکٹر اقبال کی شخصیت ایسی ہی موج تھی اور اس کا سمندر عالمِ اسلام تھا۔ میں اس سمندر کا ایک گمنام قطرہ بھلا کیا بتا سکتا ہوں کہ موج اٹھی اور اس نے سمندر کو یکسر ہلا دیا، تڑپ کر آسمان کا منہ چوما اور پھر بیٹھ کر سمندر بن گئی تو اس میں موج اور موج کو پیدا کرنے والے کی کیا صفت تھی وہ کیسے اور کیوں نہ تھی، اس نے کیے اور کیوں نہ کیے

میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ یہ موج ، ہوتی تو کوئی نہ تھا جو مجھے اپنے پہلو میں لیتا اور اتنا اونچا اٹھا دیتا کہ سمندر کو دیکھوں ، سمندر کے پھیلاؤ کو دیکھوں ، دونوں جہان پر ایک نظر ڈالوں اور تھوڑی دیر کے لیے سمجھ لوں کہ قطرہ کی بھی کچھ ہستی ہوتی ہے۔

عبدالقادر سروری
ایم اے صدر شعبۂ اُردو و فارسی
میسور یونیورسٹی

اقبال
حیات اور شاعری

"طرزِ جدید کا حق ادا کرنا میری طاقت سے باہر تھا۔ البتہ میں نے اُردو میں نئی طرز کی ایک ادھوری اور ناپائیدار بنیاد ڈالی ہے اس پر عمارت چُننی اور اس کو ایک قصرِ رفیع الشان بنانا ہماری آئندہ ہونہار اور تیار نسلوں کا کام ہے جن سے امید ہے کہ اس بنیاد کو ناتمام نہ چھوڑیں گے۔"

(حالی "مجموعۂ نظم")

جدید اردو ادب کا مشکل سے کسی موجودہ شاعر یا انشا پرداز کے متعلق کچھ لکھنا چاہے تو جب تک سرسید احمد خاں اور حالی کی خدمات کا اعتراف نہ کر لے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا۔ حق یہ ہے کہ نثر کے لئے سرسید نے اور شاعری کے لئے حالی نے جو عہد آفریں خدمت انجام دی ہے وہ تاریخ ادب اُردو کے صفحات سے کبھی نہیں مٹ سکتی ان بزرگوں کے اثرات موجودہ نسلوں میں آج تک زندہ ہیں۔ قدیم شاعری اور

اسالیبِ انشا پردازی سے بغاوت کے جو تخم انھوں نے بوئے تھے وہ فطرت ایک نئے بار آور درخت کی صورت میں نشو و نما پا رہے ہیں۔ زندہ شاعروں میں اس عہد آفریں کلاسک سے زیادہ عظیم الشان مظہر خود اقبال کی شاعری ہے جس کی اپنی تخم ریزی گزشتہ سے زیادہ اہم نتائج پیدا کرنے کی ذمہ دار ہے۔

ادبیات ہمیشہ قومی زندگی کا عکس سمجھی گئی ہے۔ مغل ہندی تمدن کے زوال کے بعد ہم میں سے وہ جوہر مفقود ہو چکا تھا جس کی موجودگی کسی قوم کی علمی اور ذہنی ترقی کی سرمایہ دار ہوتی ہے۔ حالی اور سرسید سے پہلے ہندوستان میں کوئی نئی بیتی شاید ہی نمودار ہوئی ہو۔ اور یہی حقیقت اس امر کی توجیہ بھی ہے کہ دورِ تنزل کے بعد سے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں کوئی ایسا قابلِ ذکر کارنامہ سرانجام نہ پا سکا جو دنیا کے ادبی شہ پاروں کے ساتھ باقی رہ سکے۔

یہ کہنا تو زیادتی ہے کہ قدیم اردو شاعری جو بیشتر غزل گوئی پر مشتمل ہے، کسی خوبی سے عاری ہے۔ یا یہ کہ اس میں فطریت مفقود ہے۔ فطرت کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں کائنات کی ہر شے داخل ہو جاتی ہے۔ اردو شاعری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ جس طرح وہ ولی سے پہلے اور میر کے زمانہ تک فطری تھی حالی کے زمانہ تک بھی فطری رہی۔ صرف اس کا دائرہ محدود تھا۔ قدیم شاعر کائنات کی گوناگوں اشیا میں سے صرف انسان کو اپنا موضوع سمجھتا تھا اور انسان میں بھی وہ غیر معمولی انسان جس کا دل کسی کی زلفِ پیچاں میں پھنسا ہوا ہو اور جو اپنے محبوب کی محبت میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو رہا ہو۔ فطرت کے ایک ہی پہلو کی پیہم تکرار آخر کار زبان کا زنگ اور ذہن کا زہر بن گئی۔ گو نظیر، امیر، انیس، مرزا دبیر اور میاں نظیر اکبر آبادی نے اپنی اپنی بساط کے موافق شاعری کی۔ اس حد کو توڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کی لیکن یہ اتفاقی بات ہے ان کے کلام کا اثر ان کے [illegible]

نہیں پڑا اور نہ یہی زمانہ جدید شاعری کی ابتدا کا شمار ہوتا۔ ان شعراء کی زبانی رجحانات
بعض وقت تو انہیں شعر کے مسلمہ دائرہ سے خارج کرنے کی طرف ثابت ہوئی۔
ماحول پر اثر ڈالنے اور شعرا اور غیر شعراء کی ذہنیتوں میں انقلاب پیدا کرنے کی خدمت
قدرت نے آزاد ہی نہیں بلکہ حالی کے سپرد کی تھی۔ حالانکہ دونوں معاصر ہیں
اور آزاد کو تاریخی لحاظ سے یہ فخر حاصل ہے کہ وہ سب سے پہلے جدید شاعر ہیں۔

حالی نے سرسید احمد خاں کی شرکت میں جو جدید آفرینی کوشش شروع کی
تھی وہ اقبال کی شاعری میں انتہائی کمال تک پہنچی نظر آتی ہے۔ گو خود حالی نے قدیم
اساتذہ فن کی صحبت میں نغمہ طرازی سیکھی تھی، اور وہ ان کے اثر سے بھی بالکل
عاری نہیں تھے لیکن طبع سلیم رکھتے تھے۔ اس لئے جب اپنی ابتدائی شعری
کوششوں سے اکتا گئے تو اپنے لئے نئی دنیا پیدا کرنی چاہی۔ اس مہم کے سر انجام دہی
ہونے کو وہ قومی خدمت سمجھتے تھے، اسی لئے انہوں نے نیت سے شاعروں اور
غیر شاعروں کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔ اس مہم میں حالی کو جس قدر کامیابی ہوئی
اس کو ہم نے حالی کے مضمون میں صاف طور سے بتلایا ہے۔ یہاں اس کے
مابعد اثرات ہمارے سامنے ہیں۔ گویا یہ حالی کی اس خواہش کی تکمیل ہے
جو اس مضمون کے آغاز میں نقل کی گئی ہے۔ حالی کے فوری عمل کا باعث
انگریزی ادب اور شاعری سے روشناسی ہوئی، لیکن اپنی زبان کی روایات
کو مد نظر رکھتے ہوئے انہوں نے کبھی اس امر کی تلقین نہیں کی کہ غزل، قصیدہ،
رباعی یا دوسرے اصناف شاعری کو چھوڑ کر انگریزی نظم کے اصناف جیسے
سانٹ اوڈ وغیرہ کو اختیار کریں۔ ان کی اصلی کوشش شاعری کے پامال
مضامین سے توجہ کو ہٹانا تھی، صنف خواہ غزل ہو یا مثنوی۔ چنانچہ خود انہوں نے
اور ان کے اکثر متبعین نے یہی کیا کہ قدیم اصناف کو قائم رکھ کر پامال اور تکراری

مضامین سے اجتناب کرنا شروع کیا۔ گویا حالی ہی کے الفاظ میں "سانچے" تو وہی رہے لیکن "پیمانے" بدل گئے۔ سانچے تو وہی رہے لیکن مطالب میں وسعت ہو گئی۔

حالی کی تلقینات کا فوری اثر یہ ہوا کہ اردو شعراء خواب سے جاگ اٹھے گو انھیں منزل مقصود کی فکر ابھی نہیں ہوئی تھی تاہم راستوں کی سمت پر تو وہ غور کرنے لگے۔ سامنے حالی کا دکھلایا ہوا راستہ تھا اور ان کے چھوڑے ہوئے نقش قدم نمایاں تھے۔ ان پر چلنا تو دشوار نہیں تھا۔ اس لیے جدید شاعری کے آغاز میں قومی، اخلاقی اور فطری شاعری کا بازار خوب گرم رہا۔ یہی اردو شعراء کی تقلید پسند ذہنیت کا ایک مظہر ہے۔ انھیں میں بعض سخن گو ایسے بھی تھے جو حالی کے مقلد تو تھے لیکن تقلید لفظی نہیں معنوی طور پر۔ انھوں نے حالی کی تعلیمی شاعری کی اسپرٹ کو خوب سمجھا اور لفظی تقلید کی بجائے ذاتی مشاہدات، تجربات اور خیالات کو اپنی شاعری کا محور بنایا۔ ان میں اسمٰعیل میرٹھی کو سب پر فوقیت حاصل ہے۔ اسمٰعیل خاص کر نیچرل شاعری کے گُر سے حالی سے بھی زیادہ اور ایسے ہی واقف ہیں جیسے کوئی قدیم یا جدید مغربی شاعر ہو سکتا ہے۔ ان کی شاعری در حقیقت حالی کی شاعری کا تتمہ ہے جس کا ایک کھلا ثبوت ذیل کے اشعار ہیں۔ اسمٰعیل حالی کی طرح اپنے زمانہ کے شعراء کی مذمت یوں کرتے ہیں:۔

سخنوران زماں کی بھی ہے یہی حالت ۔۔۔ کہ اس قدیم ڈگر کو نہ چھوڑیے زنہار
سوائے عشق نہیں سوجھتا انھیں مضموں ۔۔۔ سو وہ بھی محض خیالی گھڑت کا اک طومار
نہ دیکھتے ہیں کبھی نیرنگ حکمت و قدرت ۔۔۔ نہ واقعات کے وہ کھینچتے ہیں نقش و نگار
ہے شاعری میں یہ پہلا اصول موضوعہ ۔۔۔ کہ جھوٹ بولیے کے بجا ہیں ایک جوش زار
تمام اگلے زمانے کا ہے یہ پس خوردہ ۔۔۔ کہ کرتے ہیں جگالی وہی کی سو سو بار

کمال اپنا سمجھتے ہیں خود ستائی کو | نہ ننگ ہے نہ حیا ہے نہ شرم و غیرت و عار
اسی طرح سے ہمارے زمانہ کے شاعر | سمجھتے اپنی خرافات کو ہیں عین وقار
جوان کے دیکھیے دیوان تو ہو کے لئے | غلیظ و گندہ سراسر نتیجۂ افکار

آگے علما، فلسفیوں، مشائخین، مصنفین وغیرہ کی برائیاں حالی کی اسپرٹ میں گنوائی ہیں۔

غرض حالی نے زبان میں نہیں خیال میں بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ شعرا کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا کرنی چاہی۔ خیال کی تبدیلی میں کئی امور شامل ہیں۔ شاعری قوم کے تمدن اور تربیت کا ایک اہم جزو اور مظہر ہے۔ اگر حقیقی ہو تو اس میں قوم کی حیات کا پورا عکس نظر آسکتا ہے۔ سرسید اور حالی کی اصلاحی کوششوں سے ہمارے قدیم تمدن کو بھی دھکا لگا۔ حالی کی شاعری کی عقبی زمین بڑی حد تک جدید مغربی تمدن تھا۔ ممکن ہے وہ اس معاملے میں سرسید احمد خاں کی طرح انتہا پسند نہ ہوں لیکن سرسید کے اصول کے موافق ضرور رہے۔ یہ اصول یہ تھا کہ کوئی تنزل پذیر قوم ترقی اسی وقت کر سکتی ہے جب وہ اپنے قدیم اور ترقی کے سدِ راہ روایات اور خیالات کی شکست و ریخت کر کے ترقی یافتہ اقوام کے ساتھ شریکِ رفتار ہو جائے۔ یہ بزرگ اس عقیدے کے موافق نہیں تھے کہ تنزل پذیر اقوام اپنی شان دار ماضی کی طرف رجوع کرنے سے پھر ابھر سکتی ہیں۔ زمانے کی ضروریات اور مطالبات کو وہ زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

جدید تمدن کے نمونوں کو دیکھ کر بہت سے قدامت پسند حضرات ان کے بلکہ اس اصول کے بھی مخالف ہو گئے۔ انہیں قدامت پسندوں میں بعض صاحبِ رائے ایسے بھی تھے جو اس حقیقت کا برملا اعلان کر رہے تھے کہ مغربی تہذیب اور تمدن کا استقبال ہندوستانیوں کی ذاتی ضروریات اور احتیاجا

کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ بالعموم ذہنیت پر حکومت کا اثر ہے۔ ان کی نظر میں مغربی تہذیب ایک طرح کا ملمع تھا جو ادنیٰ درجے کی دھات پر صرف اس لئے چڑھایا جاتا ہے کہ اصلیت سے زیادہ شان دار دکھا سکے۔ ممکن ہے کہ ہمیں میں سے بعض بزرگ مغربی بنیادوں پر سرسید اور حالی کے اصول سے مخالفت پر کمربستہ ہو گئے ہوں۔ اس طرح کی مخالفتیں نثر اور نظم دونوں کے ذریعے ہوئیں۔ نثر تو اس زمانے کے اخبارات میں دفن ہے لیکن شاعری میں خان بہادر اکبر حسین الہ آبادی کی کوششیں چوٹی پر نظر آتی ہیں۔ اکبر کی شاعری پر ہم نے گزشتہ کسی مضمون میں مفصل بحث کی ہے۔ یہاں ربط مضمون کے لئے اس کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالنی ضروری ہے۔

اکبر کی شاعری کا مطالعہ صاف طور پر بتلا رہا ہے کہ وہ مغربی تہذیب کی والہانہ اور کورانہ تقلید کو ایک قوت فیصلہ رکھنے والی قوم کے افراد کے لئے بے حد مذموم جانتے تھے۔ انھیں نظر آ رہا تھا کہ ہندوستانی ترقی کے جوش اور ولولے میں بلکہ ترقی کی تقلید میں اپنے تمدن کی خوبیوں اور روایات کو بھی بے دردی کے ساتھ پامال کر رہے ہیں۔ ہندوستان کے تمدن میں مغربی تمدن کا پیوند انھیں عجیب بے جوڑ معلوم ہوتا تھا۔ پھر ترقی کی خیالی بنیادوں پر عمارت کا بننا، اس کی کشمکش، چھین جھپٹ، خود غرضی ہر کوشش ان کے حساس دل کو بری طرح جلا رہی تھی۔ اور یہ جلے دل ہی کا اثر تھا جو ایسے جلے کٹے شعر نکلتے تھے

ترقی کی قسمیں ہم پر پڑا کیں — گھٹا کی دولت انھیں پر برسا کیں
رہیں ہم پھر کے بی اے پاس بنیں — وہ گو اسکول میں برسوں پڑھا کیں

گھر سے جب پڑھ لکھ کے نکلا کوئی لڑکا — دلکش و آزاد و خوش رو نیا ساختہ پرداختہ
پھر کیا معلوم کیا تو تمدن کے ہو گئے چنیں — ہاں نکلتے ہیں ہو گی نیل اور ظرف نیا ساختہ

مغربی تہذیب آگے چل کے جو تماشا دکھائے ۔۔۔ ایک مدت تک رہیں گے نوجواں دل باختہ

کہیں کہیں اکبر نے حالی اور سرسید پر تعریض بھی کی ہے۔ کھلی یا پوشیدہ، دونوں طرح۔

دلا دے ہم کو بھی صاحب کلکٹری کا پروانہ ۔۔۔ قیامت تک رہے سید ترے اعزاز کا ڈنکا

الا یا ایہا الطفلاں بجز راحت بنا دلہا ۔۔۔ کہ قرآں سہل بنمود اول ولے افتاد مشکلہا

بجن تہذیب پہنے خوب بوٹ و اسپ و پتلون ۔۔۔ کہ سرسید خبردار است ز رسم و راہ منزلہا

قوت کم ہے نہ رنج لیڈری کی موج ہے ۔۔۔ عقل ہے اپنی قوم پہ لفظوں کی فوج ہے

ظاہر ہے کہ اکبر نے یہ سب کچھ اس لئے کہا کہ ان کو بھی سرسید ہی کی طرح قوم کی فلاح کا درد تھا اور اس سے کچھ کم نہ تھا جتنا سرسید یا حالی کو تھا۔ اختلاف صرف نقطۂ نظر کا تھا۔ اکبر یہ بھی سمجھتے تھے کہ زمانہ سرسید اور حالی کی کوششوں کا ساتھی ہے تاہم وہ ترقی کے خواہشمندوں کو اس کے راستے کی دشواریوں کے ساتھ ساتھ ان کے نتائج و دشواریوں سے بھی واقف رکھنا چاہتے تھے۔ نیز صاف اُن کا خیال میں انھیں ایک طرف حکومت کی چیرہ دستیوں کا خوف تھا تو دوسری طرف نئے تمدن کے پرستاروں کا جوش عمل سے انھیں کھٹکا لگا ہوا تھا کہ ان کے مشاہدات اور تاثرات پوری طرح ظاہر نہیں ہو سکیں گے۔ اسی لئے انھوں نے ظرافت کا پیرایہ اختیار کر کے اپنی شاعری پڑھنے والوں سے پہلے اپنے خیالات پر خود آپ ہنسنا اور ہنسانا شروع کیا۔ اکبر کی شاعری میں یہ چیز اس کے موضوع شاعری کے برابر اہم ہے۔

تاکید وضع ملت و دنیا کی کر گئی میں ۔۔۔ اہلِ زمانہ لاکھ ہنسیں شیخ غریب پر

ہوتا نہیں طبیب دوا سے دست کش ۔۔۔ پیچ ہے اہل تو ہنستی ہے سعی طبیب پر

آزاد، حالی اور اسمٰعیل کے عمل اور اکبر کی مخالفت کے اثرات ابھی نمایاں بھی نہ ہونے پائے تھے کہ سیالکوٹ کا یہ نوجوان شاعر اٹھتا ہے۔ اور اپنے ذوق کی دستیاری سے نغمہ سنجی شروع کرتا ہے۔

پہلے تو وہ ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کا ذاتی تجربہ اس کو ایسی لَے اختیار کرنے پر مجبور کر دیتا ہے جو اس کے ہم عصروں میں سب سے زیادہ اہتزاز پیدا کرنے والا ہے۔

شاعر کے ذاتی حالات کا اس کے کلام پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ اقبال کا خاندان کشمیر کا ایک قدیم و معزز خاندان ہے۔ ان کے اجداد دینی علوم سے خاص شغف رکھتے تھے جس کا گہرا اثر کلام سے نمایاں ہے۔ اقبال خود سیالکوٹ میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد آ کر رہ گئے تھے۔ ولادت ۱۸۷۶ء میں ہوئی۔ سیالکوٹ ہی میں ابتدائی عمر کا زمانہ بسر ہوا اور بعد کو ڈگری کی تعلیم کے لئے وہ لاہور چلے آئے۔ کشمیر کی دلفریبی سے ایک عالم متاثر ہے۔ اقبال جیسے شاعر کے دل سے اس شعریت سے پُر خطۂ زمین کی یاد کیسے نکل سکتی تھی؟ بچپن کے اکثر قطعات میں کشمیر کو یاد کیا ہے۔ ؎

کشمیر کا چمن جو مجھے دلپذیر ہے　　اس باغ جاں فزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثے میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائداد　　جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دور　　یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دور
ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر　　بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور

کیا عجب ہے کہ ذیل کے اشعار میں بھی یہی احساس کام کر رہا ہو

کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں　　ساتھی تو ہیں وطن میں میں قید میں پڑا ہوں

ارمان ہے یہی ہیں اُڑ کر چمن کو جاؤں
ٹہنی پہ گل کے بیٹھوں آزاد ہو کے گاؤں

پھر دن پھریں ہمارے پھر سیر ہو وطن کی
اڑتے پھریں خوشی سے کھائیں ہوا چمن کی

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے
دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے
گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

اقبال کی خاندانی خصوصیات کی طرح ان کی تعلیم کی روش نے بھی ان کی شخصیت کو بنانے میں بڑا حصہ لیا۔ ابتدائی تعلیم کے لیے وہ سیالکوٹ کے ایک قدیم مکتب میں بٹھائے گئے۔ آئندہ فدائی مشرق کے دل میں مشرقی فنون سے عشق کی تخم ریزی ہوئی تھی۔ یہاں اقبال نے کچھ ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں کہ ضرورت زمانہ نے انھیں مکتب چھوڑ کر انگریزی مدرسہ میں شریک ہونے پر مجبور کیا۔

گو یہ ضروری نہیں ہے کہ دنیا کی تمام بڑی ہستیاں اپنی ابتدائی تعلیم میں یا تعلیم کے کسی خاص مرحلہ میں اپنی ہم جماعتوں سے ممتاز رہی ہوں اور اسی طرح ہر ممتاز طالب علم زندگی کی کشمکش میں کامیاب رہے تاہم اقبال ان ہستیوں میں سے ہیں جو ہر جگہ اور ہمیشہ بلندی کے ممتاز معیار پر رہی ہیں۔ امتیاز کے ساتھ انھوں نے ابتدائی، وسطانی اور فوقانی تعلیم ختم کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے اسکاچ مشن کالج میں شریک ہونے کے ساتھ ہی انھیں پبلک مقبولیت بھی حاصل ہونے لگی۔ وقوع امر سے پہلے اس کے اسباب فطرت کی طرف سے فراہم ہو جاتے ہیں۔

اس کالج میں اقبال جیسے ذہین طالب علم کو ایک جید عالم کا سہارا مل گیا۔ یہ مولوی سید میر حسن ہیں جو بعد میں شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ مولوی صاحب عربی اور فارسی کے متبحر عالم تھے۔ ان کے شخصی اثر کے متعلق آنریبل سر شیخ عبدالقادر

لکھتے ہیں "ان کی تعلیم کا یہ خاصہ ہے کہ جو کوئی ان سے فارسی یا عربی سیکھے اس کی طبیعت میں اس زبان کا صحیح مذاق پیدا کر دیتے ہیں۔" عربی اور فارسی سے مناسبت طبعی اقبال کو خاندانی ترکہ میں ملی تھی۔ اس پر میر حسن جیسے عالم کا ساتھ گویا سونے اور سہاگہ کی یکجائی۔

اقبال کا ذوق سلیم اور عربی اور فارسی زبانوں کا صحیح مذاق اسی تعلق کا نتیجہ ہے۔ اسی کی دستیاری سے وہ آئندہ اردو سے زیادہ فارسی شاعری میں کامیابی حاصل کر سکے۔ اور اردو میں نئے فلسفیانہ اور صوفیانہ مضامین کے ادا کرنے کے لئے سانچے فراہم کر دیئے۔ ان کی لفظ تراشی میں جس قدر گہرائی ہے اس سے زیادہ ادبیت بھی موجود ہے۔ فارسی شاعری میں اقبال کے کارنامے لازوال ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ اس آخری دور میں جس طرح اقبال اردو کے بیش شاعر ہیں فارسی میں بھی ان کا ہندوستان میں کوئی مدمقابل نہیں ایران میں تو اب بڑے شاعروں کا پیدا ہونا گویا مسدود ہی ہو گیا۔

اسکاچ مشن کالج سے اقبال نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ نہ صرف عربی بلکہ انگریزی میں ان کی متواتر کامیابی نے انھیں وظیفے اور تمغے دلائے۔ یہیں اقبال کی شاعری کی مقبولیت کی بھی ابتدا ہوئی۔ شاعر کی حیثیت سے اقبال ان لوگوں میں ہیں جن کی طبیعتیں ابتدا ہی سے بار آور ہوتی ہیں۔

لیکن اقبال کی آئندہ عظمت کا بنیادی پتھر لاہور میں رکھا گیا جہاں وہ بی اے کی تعلیم کے لئے آ گئے تھے۔ لاہور کے گورنمنٹ کالج میں اقبال فلسفہ لینا اختیاری مضمون لے کر داخل ہوئے۔ گزشتہ لسانی تعلم کے مرحلے سے گزرنے کے بعد یہاں فن فلسفہ میں بھی ایک ایسا شفیق استاد مل گیا جس کو خود مشرق اور خصوصاً اسلام سے خاص انس تھا۔ یہ علی گڑھ کے مشہور پروفیسر آرنلڈ تھے

جو بعد میں سر آرنلڈ ہو گئے تھے ان کی شخصیت سے مرعوب اقبال بھی بے حد متاثر رہے۔ اور لکھتے ہیں کہ "جیسے انہوں نے علی گڑھ کالج کی پروفیسری کے زمانے میں اپنے دوست مولانا شبلی مرحوم کے مذاقِ علمی کے پختہ کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی" اس دوسرے موقع پر بھی پروفیسر موصوف نے اقبال جیسے شاعر کے خیالات کو سنوارنے میں سعی مشکور کی، اور اس طرح اردو کے دو بڑے ادیب ان سے متاثر ہوئے۔

جس طرح اقبال نے اپنی غیر معمولی ذہانت سے پروفیسر آرنلڈ کے دل میں جگہ پیدا کر لی تھی اسی طرح آرنلڈ کی اعلیٰ قابلیت نے بھی اقبال پر احترام اور محبت کے لازوال اثرات چھوڑے۔ ان باہمی تاثرات کی ناقابلِ فراموش یادگار "نالۂ فراق" کے زبردست جذبات ہیں۔ انہیں کی صحبت میں دراصل اقبال کا فلسفیانہ کردار بنا اور نشو و نما پایا۔ یہی وہ تعلق ہے جس نے اردو کو ایک غور و فکر کرنے والا شاعر عطا کیا۔

یوں تو اسکاچ مشن کالج ہی سے اقبال کی شاعری شروع ہو چکی تھی لیکن لاہور میں آکر وہ خوب چمکی۔ اس کے کئی اسباب ہیں پہلے تو یہ کہ دہلی اور لکھنؤ کی گلشن سے چھوٹنے کے بعد اردو ادب اور شاعری کو اب لاہور میں ٹھکانا نصیب ہوا تھا۔ اسی زمانہ میں کلکتہ کے علاوہ علمی سرگرمی میں یہ ہندوستان کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ دوسرے دہلی اور لکھنؤ کے بعض بچے کھچے شاعر بھی یہاں جمع ہو گئے تھے جن میں مرزا ارشد گورگانی دہلوی اور میر ناظر حسین ناظم لکھنوی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کے قیام نے لاہور کے باذوق حلقوں میں ایک بار ذوقِ شاعری کی بنیاد ڈال دی تھی۔ اقبال کا ذوقِ شاعری بھی ان کو کشاں کشاں اس محفل تک لے گیا۔ ان کی قابلیت نے محفل

شاعروں کے تمام اراکین کو ان کا مداح اور دوست بنا دیا اور خود اقبال کو یہ فائدہ ہوا کہ انھیں مرزا ارشد کی فیض صحبت سے مستفید ہونے کا موقع مل گیا۔ داغ دہلوی سے مشورہ کرنے سے پہلے اقبال نے ارشد گورگانی سے بھی اصلاح لی۔

ابھی دہلی کے آخری شاعر مرزا خاں داغ دہلوی زندہ تھے۔ ان کی غزل خوانی کے انوکھے انداز نے انھیں نہ صرف اُردو کے پچھلے تمام شاعروں سے ممتاز بنا دیا تھا بلکہ اپنے معاصرین شعراء میں استادی کا درجہ بھی عطا کر دیا تھا۔ گو یہ ملازمت کے سلسلے میں دکن آ گئے تھے لیکن ان کا فیض ہندوستان بھر میں بواسطہ اور بلا واسطہ برابر جاری تھا۔ اقبال ابتدائی غزل گوئی میں ان کے رنگ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ مراسلت کے ذریعہ ان کی شاگردی اختیار کر لی۔ اس واقعہ کا اثر صرف واقعے کی حد تک نہیں ہے بلکہ اقبال کی ابتدائی غزلوں کو بنانے اور ان کی زبان کو درست کرنے میں یہ بڑا کارگر ثابت ہوا۔ ابتدائی غزلوں کی زبان میں وہ مرزا داغ کی سلاست اور شوخی میں ایسی ندرت کو جگہ دینا چاہتے ہیں جس سے داغ کی شاعری ممتاز ہے۔ ذیل کے انتخاب سے یہ امر بخوبی واضح ہو جائے گا۔

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی؟   مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی؟
تمھارے پیامی نے سب راز کھولا   خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی؟
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا   تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی؟
تأمل تو تھا ان کو آنے میں قاصد   مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی؟

کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا
فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی؟

اس طرح کی غزلیں اس میں شک نہیں کہ اقبال کے پاس کم ہی تھیں ان کے قصداً نظر انداز کر دیئے جانے کا سخت احتمال ہے۔ اقبال کی طبیعت بچپن سے سنجیدہ واقع ہوئی ہے۔ داغ کی شاعری کا اثر ان کے دل سے بہت جلد دور ہو گیا ہوگا۔ کیونکہ زبان کی چاشنی سے ہٹ کر تغزلی مضامین کے سوا ان کے پاس کیا تھا جو اس فلسفی شاعر کی توجہ کو الجھائے رکھتا۔ یقین ہے اقبال نے اس طرح کی غزلیں انتخاب کے وقت خود چھانٹ دی۔

غزل کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کے سب سے زبردست ماخذ کا انکشاف بھی ضروری ہے۔ داغ کی شاعری سے سیری حاصل ہو جانے کے بعد فطرتاً اقبال کی طبیعت کو غالب کے کلام سے لگاؤ پیدا ہوا۔ غالب کا کلام درحقیقت اقبال کے مطالعہ کے قابل تھا۔ کیونکہ دونوں کی ذہنیت بڑی حد تک مشابہ ہے۔ غالب میں وہی عمق ہے جس کی اقبال کے دماغ کو ابتدا سے تلاش تھی۔ شاعر خصوصاً بڑھتا ہوا شاعر ہمیشہ مضطرب ہوتا ہے اس کی ذہنی بےچینی کو کہیں سکون مل سکتا ہے تو وہ صرف عمیق خیالات کی دنیا میں، اقبال کے متلاشی دماغ کو غالب کے کلام میں ایک ساتھی مل گیا۔ اس کے بعد انہوں نے جو غزلیں کہیں وہ لفظاً اور معناً غالب کی تقلید نہیں تو غالب کے کلام سے متاثر ضرور ہیں۔ ذیل کے اقتباسات دیکھیے تو وہی اندازِ خیال، وہی طرز کی ترکیبی چالیں، وہی مشکل پسندی اور بعض وقت تو وہی صوری اور معنوی تقلید نظر آئے گی

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی	ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی
منصور کو ہوا لبِ گویا پیامِ موت	اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی
ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر	ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

عذر آفرینِ جرمِ محبت ہے حسنِ دوست
محشر میں عذرِ تازہ نہ پیدا کرے کوئی

نظارے کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

کہوں کیا آرزوئے بیدلی مجھ کو کہاں تک ہے
مرے بازار کی رونق ہی سودائے زیاں تک ہے

سکونِ دل سے سامانِ کشودِ کار پیدا کر
کہ عقدہ خاطرِ گرداب کا آبِ رواں تک ہے

"سکونِ دل"، "کشودِ کار"، "عقدۂ خاطرِ گرداب کا آبِ رواں" وغیرہ کا جواب تلاش کیجیے تو سوائے غالب کے دیوان کے اور کہیں نہ ملے گا۔

بہرحال اقبال نے ارشد سے صوری تلمذ حاصل کیا۔ داغ سے تحریری اصلاح لی مگر غالب سے معنوی استفادہ کیا۔ اور یہ آخری اثر ان کی طبیعت کے مناسب تھا، اس لئے وہ دیرپا ہے اور اب تک کسی نہ کسی صورت میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ ان شعراء کے اثرات کا اختلاف ایک اور طرح بھی ظاہر ہو سکتا ہے۔

"اقبال نے داغ کے انتقال پر اظہارِ غم کیا

بلبلِ دلی نے باندھا اس چمن میں آشیاں
ہمنوا ہیں سب عنادل باغِ ہستی کی جہاں

اب کہاں وہ بانکپن وہ شوخیٔ طرزِ بیاں
آگ تھی کافورِ پیری میں جوانی کی نہاں

تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے
لیلیٔ معنی وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے

لہ ۔ اس کے مقابلہ میں غالب کی وہ غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

اب صبا سے کون پوچھے گا سکوتِ گل کا راز
کون سمجھے گا چمن میں نالۂ بلبل کا راز؟
تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں
آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

اس سے بہتر مرزا خاں داغ کی شاعری کی تعریف نہیں ہو سکتی تھی

آخر میں اقبال کے جذباتِ محبت بھی پھوٹ پڑتے ہیں۔

"مرزا غالب" پر بھی ایک نظم لکھی ہے۔

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا؟
تھا سراپا روح تو، بزمِ سخن پیکر ترا
زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ وار
زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلی گلِ شیراز پر
لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں

اس سے بڑھ کر کسی شاعر کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ شاعر کے دل پر غالب کا زبردست قبضہ اور اس سے پیدا ہونے والے جذبۂ احترام پوری نظم میں ہر جگہ نمایاں ہیں۔ یہی فرق غالب اور اقبال کے اثرات کا ہے۔

قومی شاعری کا مضمون حالی نے بہت ہردلعزیز بنا دیا تھا۔ اس کے باوجود اقبال اب تک اس طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے۔ اس طرف اقبال کی توجہ کا سبب بھی ان کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے۔

جب اقبال لاہور کے ادبی خصوصاً شاعروں کے حلقے میں بازارِ حکیمان کے مشاعرے کی نظموں کی وجہ سے روشناس ہو گئے تو ان کے دوستوں نے انھیں اس خدمت پر بھی آمادہ کر دیا۔ جو ان سے پہلے حالی، شبلی اور نذیر احمد انجام دیتے رہے تھے۔ لاہور کی انجمن حمایت الاسلام بڑا قدیم ادارہ ہے۔ اس کے سالانہ جلسوں کا افتتاح بھی علی گڑھ کے پاس سے متعلق چندوں کے جلسوں کی طرح قومی نظم سے عمل میں آتی تھی۔ اقبال بھی دوستوں کے مجبور کرنے سے اس خدمت کے بجا لانے پر آمادہ ہو گئے۔ جو نظم پہلی مرتبہ انھوں نے پڑھی وہ "نالۂ یتیم" تھی۔ گو یہ اقبال کی پہلی نظموں میں سے ہے لیکن اس کے مقابلے میں آزاد، حالی، شبلی اور نذیر احمد کی نظمیں نقشِ اولین معلوم ہوتی ہیں۔

جو تسلسل، جو عمق اور جو قوتِ نامیہ اس نظم میں ہے، وہ اگلی کسی نظم میں نہیں۔

یہ گویا اقبال کی "قومی نظم" نگاری کی ابتدا تھی۔ اس کے بعد کئی اور "قومی نظمیں" جیسے "ابرِ گہربار"، "فریادِ امت" وغیرہ اُن ہی سالانہ جلسوں میں پڑھی گئیں۔

اسی زمانے کا ایک اور اہم واقعہ اقبال کی سر شیخ عبدالقادر سے ملاقات ہے جس کا ذکر شیخ صاحب نے دیباچہ "بانگِ درا" میں کیا ہے۔ شیخ صاحب اس وقت اردو کے سب سے بہتر رسالے "مخزن" کو مرتب کیا کرتے تھے اور اقبال سب سے اچھے شاعر بن رہے تھے۔ دونوں میں یگانگت کا پیدا نہ ہونا تعجب کا سبب ہوتا۔ یہ ادبی دوستی انگلستان میں زیادہ مستحکم ہو گئی۔ چنانچہ اقبال جب یورپ سے متاعِ علم لوٹ کر وطن واپس آنے لگے تو مالِ غنیمت سے اپنے وطن کی ذہنی تزئین میں شیخ صاحب کی مدد کے طلبگار ہوتے ہیں۔

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور سے
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں
ایک فریاد ہے مانند سپند اپنی بساط
اسی ہنگامے سے محفل تہ و بالا کر دیں
اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق
سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں
اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دے کر
قطرۂ شبنمِ بے مایہ کو دریا کر دیں
رختِ جاں بت کدۂ چیں سے اٹھا لیں اپنا
سب کو محوِ رخِ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں

دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں
گرم رکھتا تھا ہمیں سردیٔ مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اُسے وقفِ تماشا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

اس میں اقبال کے اس انقلابِ خیال کے جراثیم موجود ہیں جو قیامِ یورپ میں واقع ہوا۔ اس کے علاوہ اُن کی آئندہ شاعری کی عمارت کا نقشہ بھی موجود ہے جس سے ہم آگے مفصل بحث کریں گے۔ شیخ صاحب کی کئی خدمات میں اردو کی ایک یہ خدمت بھی نہایت عظیم الشان ہے کہ انھوں نے ایک بھٹکے ہوئے شاعر کو رستے پر لگا دیا۔ یورپ میں اقبال نے شاعری کو ترک کرنے کا جو ارادہ کر لیا تھا وہ شیخ صاحب ہی کی صحبت عملی سے فسخ ہو گیا۔ اقبال کی شاعری کو مجتمع کرنے میں بھی شیخ صاحب نے یہ احسان کیا کہ سب سے پہلے اس کے چمن نمایاں دو دوروں کا پتہ لگایا جس پر اکثر بعد کے تنقید نگاروں کے خیالات مبنی ہیں۔ اقبال کی بعض بہترین نظمیں جیسے "ہمالہ"، "تصویرِ درد" وغیرہ شیخ صاحب کے رسالے "مخزن" ہی میں پہلے پہل شائع ہوئیں۔

گورنمنٹ کالج لاہور سے اقبال نے بی اے اور ایم اے کے امتحانات امتیاز کے ساتھ کامیاب کیے اور تھوڑے ہی عرصہ میں پہلے اورینٹل کالج لاہور اور پھر اپنی قدیم درس گاہ گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہو گئے۔ اس وقت تک اقبال کی شاعری مخصوص اداروں یا مشاعروں کی غزل خوانی سے آزاد ہو کر عام ہو گئی تھی۔ اب نظموں کو پڑھ کر سنانے کا موقع باقی نہیں رہا

عوام اُن کا استقبال کرنے کے لیے ہر جگہ تیار رہتے تھے۔ اور یہ اخبارات اور رسائل کے ذریعہ اُن تک پہنچ جاتیں۔ شاعر کا مضمون مخصوص نہیں ہوتا اس کا دل مصوری کا آلہ ہوتا ہے جس میں ہر وہ چیز منعکس ہو جاتی ہے جو اس کے سامنے آجاتی ہے۔ اس وقت ہندوستان کی تمام قوموں کے مابینی اختلافات اور اُن کی خیالی بنیادوں پر جان توڑ کشمکش نے ہر جگہ اودھم مچا رکھا تھا۔ اقبال بھی ہر درد مند کی طرح اس حالت کو دیکھ کر متاثر ہوتے اور فریاد کرتے ہیں۔ اسی سبب سے ان کی اس دور کی شاعری میں وطن پرستی کا جز غالب ہے۔ "ہمالہ" "صدائے درد" "تصویرِ درد" "نیا شوالہ" "ترانۂ ہندی" وغیرہ نے اقبال کو حالی اور اکبر کی صف میں نمایاں جگہ دلا دی۔

۱۹۰۵ء میں اقبال اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ گئے۔ جاتے ہوئے بجائے دنیوی سفارشات فراہم کرنے کے، وہ روحانی استعانت کے لیے حضرت محبوب الٰہی کی درگاہ پر گئے۔ مزار پر جو نظم پڑھی وہ کئی پہلوؤں سے اہمیت رکھتی ہے۔ پہلے تو اس سے شاعر کی طبیعت کا رجحان معلوم ہوتا ہے، پھر جو التجا کی ہے وہ دنیوی طالبوں کی طرح عزت و ثروت یا شہرت کی نہیں بلکہ ایک اعلیٰ علمی معیار کے حصول کی ہے جو شاعر کا نصب العین تھا۔

نظر ہے ابرِ کرم پر درختِ صحرا ہوں
کیا خدا نے نہ محتاجِ باغباں مجھ کو

فلک نشیں صفتِ مہر ہوں زمانے میں
تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو

مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو

مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے
کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو

یورپ میں اقبال نے اسی نصب العین کو حاصل کرنے کی سعی کی۔ انھیں جو بچپن سے عربی، فارسی اور پھر فلسفہ کا شوق تھا، تحقیقات بھی کی، تو انہیں سے متعلق۔ ڈاکٹری کے لئے "ایران اور ما بعد الطبیعیات" پر مقالہ لکھا۔ لندن سے بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔ باقی وقت ان کا شرقی اور مغربی زبانوں کے شاہکاروں کے مطالعہ میں صرف ہوا۔ جن میں فلسفہ کی حد تک شوپن ہار، ہیگل، کانٹ، برگساں، لاک اور شاعری میں شکسپیئر، بائرن، براؤننگ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

یورپ کے قیام میں اقبال کی ملاقات بعض ایسے علماء سے ہوگئی جن کی دنیا میں کافی شہرت ہے۔ یہ پروفیسر براؤن، آرنلڈ، ڈاکٹر نکلسن وغیرہ ہیں۔ ان میں بعض کی دوستی کو اقبال کی حیات کے ساتھ خاص تعلق ہے۔ ڈاکٹر نکلسن ان کی شاعرانہ قابلیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جب اقبال نے اپنی شہرۂ آفاق نظم "اسرارِ خودی" لکھی تو ڈاکٹر نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کر کے تعلیقات کے ساتھ اس کو شایع کیا۔ اس ترجمہ نے در اصل اقبال کو انگریزی اور دوسرے مغربی علماء کے وسیع تر حلقوں سے روشناس کیا۔ یورپ ہی میں اقبال کی فارسی شاعری کی ابتداء اور شہرت ہوئی۔ اس کی ابتداء کا واقعہ سر شیخ عبدالقادر نے اپنے مقدمہ "بانگِ درا" میں بیان کیا ہے۔ پہلی ہی غزل لکھنے کے بعد اقبال کو معلوم ہوا کہ ان کی طبیعت فارسی شعر گوئی میں بھی ویسی ہی رواں ہے جیسی اردو میں تھی۔ یہ ایک انکشاف تھا جس سے اقبال نے بے حد فائدہ اٹھایا۔ ان کی بہترین شاعری فارسی میں ہے۔ اردو میں اس سے فطری حدود

کے لحاظ سے ان کی شاعری ہندی اور ہندوستانی تھی۔ لیکن فارسی شاعری کا مخاطب تمام عالم اسلامی ہو گیا۔ فارسی شاعری میں اس وسعت کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔

یورپ ہی کے قیام سے متعلق ایک اہم بات اور رہ گئی ہے یہاں رہ کر اقبال نے جس طرح علمی خزانوں کو ٹٹولا اسی طرح ذہنیتوں اور معاشرہ کا بھی بغور مطالعہ کیا۔ جو انقلاب ان مشاہدات سے ان کے نقطہ نظر میں پیدا ہوا۔ وہ ان کی فارسی سے کہیں زیادہ اردو شاعری میں بے حد نمایاں ہے۔ کیونکہ فارسی شاعری در اصل یورپ کے بعد شروع ہوئی۔ لیکن یورپ جانے سے پہلے کی اردو شاعری بعد کی شاعری کے لیے موازنہ کا کام دیتی ہے۔

پروفیسر آرنلڈ ہندوستان سے جانے کے بعد لندن یونیورسٹی میں عربی کے معلم مقرر ہو گئے تھے۔ اتفاق سے جن دنوں اقبال یورپ میں مقیم تھے پروفیسر صاحب کو کسی مجبوری کی وجہ سے رخصت لینی پڑی تھی۔ ان کے غیاب میں اقبال ان کا کام انجام دیتے رہے۔ یہ ایک ہندوستانی کے لیے ان کی قابلیت کا قابل فخر اعتراف ہے۔

سنہ ۱۹۰۸ء میں اقبال ولایت سے وطن واپس ہوئے اور تھوڑے عرصے کے بعد گورنمنٹ کالج کی ملازمت ترک کر کے وکالت شروع کر دی۔ اقبال کی شاعری کا یہی بہترین اور پختہ کارانہ دور ہے۔ یہ دور شاعری کی کیفیت اور کمیت دونوں لحاظ سے بے حد اہم اور درحقیقت یہی شاعری کا منتہا ہے۔

ہم نے اوپر کہیں اس کا ذکر کیا ہے کہ سب سے پہلے سر شیخ عبد القادر نے اقبال کی شاعری کے تین دوروں کا پتہ لگایا۔ پہلا دور ابتدائی مشق سے لے کر سنہ ۱۹۰۵ء میں اقبال کے یورپ جانے تک ہے۔ دوسرا دور قیام یورپ کا اور

تیسرا ۱۹۰۸ء میں وطن لوٹنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ شاعر کے کلام اور ان کی ذہنیت کا ارتقا معلوم کرنے کے لیے خاص خاص زمانوں میں شاعر کے میلانات کا پتہ لگانا ضروری ہے۔ خصوصاً وہ شاعر جو اپنے عہد کی پیداوار ہو۔ اقبال کی شاعری میں ان تینوں زمانوں کا فرق اس قدر نمایاں ہے کہ وہ نقاد جو ان کی حیات، ماحول اور ان کی طبیعت پر ان کے اثرات سے ناواقف ہوں شاید ان کی بعد کی یا پہلی نظموں کو ان کے نام سے منسوب کرنے میں پس و پیش کریں۔ بعض حالات میں ان کا نقطہ نظر اس قدر بدل گیا ہے کہ پہلے سے متضاد معلوم ہوتا ہے۔

پچھلے صفحات میں اقبال کی حیات کے ان تمام اہم پہلوؤں پر ہم نے کافی روشنی ڈالی ہے جن سے ان کی شاعری مختلف اوقات میں متاثر رہی۔ ہمیں امید ہے کہ ان امور کی مدد سے ان کی شاعری کی اسپرٹ کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

اگلے اور پچھلے تمام شاعروں کی طرح اقبال کو بھی خود حاصل کرنے سے پہلے شاعر سازی کے کارخانے سے بھی گزرنا پڑا۔ متقدمین کی طرح اقبال کی ابتدا بھی غزل کی شاعری سے ہوئی۔ انہیں قدیم استادانِ فن کی شاگردی بھی کرنی پڑی جس کی تفصیلات پیچھے گزر چکی ہیں۔ اقبال نے قدیم شاعری کی مشق سے انتہائی فائدہ اٹھایا جتنا کسی پہلے اساتذۂ سخن نے اٹھایا تھا۔ لاہور میں انہیں ارشد گورگانی سے بہتر شاعر نہیں مل سکتا تھا۔ اقبال نے ان سے تلمذ حاصل کیا۔ پھر جب نظر اور وسیع ہوئی تو داغ جیسے استادِ فن کو غزل دکھائی۔ اس طرح سے بھی سیری ہو گئی تو پھر وہ غالب کی شاعری سے استفادہ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان تینوں اساتذہ سے استفادہ کرنے کے بعد بھی

اقبال نے ایک سچے شاعر اور متلاشیِ حقیقت کی طرح دُنیا کے دوسرے بڑے بڑے شاعروں کے کلام سے الہام حاصل کیا۔ جو کچھ سیکھا تھا اس پر قانع ہونے کے بجائے انہوں نے اپنی اُپج سے کام لے کر قدما کے ذخیرہ میں بیش بہا اضافہ کیا۔ غزل کی شاعری میں جب پختہ کار ہو گئے تو مغربی شعراء کے کلام سے بہترین خیالات اور بہترین اسالیب کو انھوں نے اپنا نمونہ بنایا۔ بڑھنے والی اقوام کے افراد کا یہی اصول رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اقبال کی غزل کی شاعری کا بڑا حصہ ہماری نظر کے سامنے نہیں ہے اور جو کچھ باقی رہ گیا ہے وہ بھی صرف ان کے نام کی نسبت کی وجہ سے پڑھا جاتا ہے۔ غرض اس باقیات الصالحات کے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے سب صحیح ہے لیکن اس کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں۔ اس سے غزل کی صنف پر ان کی قدرت کا پتہ چلتا ہے۔ جہاں داغ کی پیروی کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ داغ کی رُوح کو اپنے جسم میں داخل کر لیا ہے۔ وہی سادگی، وہی شگفتگی اور وہی زبان کا چٹخارہ ہے جو داغ کے کلام کی خصوصیت ہے۔ بعد میں جب غالب کے کلام نے ان پر تسلط جمایا تو یہ غالب ہی کے رنگ میں کہنے لگے تھے۔ اگر یہی مشقِ سخن جاری رہتی تو یہیں توقع ہے کہ اردو میں ایک دوسرا غالب پیدا ہو جاتا۔ داغ کی شاعری سے زبان کی روانی اور سلاست سیکھنے کے بعد غالب کی شیریں بحر کے تتبع نے انہیں ایک مکمل غزل گو شاعر بنا دیا تھا۔ یہ ابتدائی مرحلے آئندہ شاعری کا پیش خیمہ ہیں۔

اساتذہ فن کی شاگردی سے مکمل کر شاعر نے جب اپنے اطراف پر نظر ڈالی تو اس کے سامنے آزاد، حالی، شبلی اور اسمٰعیل کی شاعری کے نمونے موجود تھے۔ اقبال کے پاس ان کا مطالعہ نہ کرنے تو رکھ نہیں سکتا تھا

کر آنکھ بند کرکے اسی روش پر گامزنی شروع کر دی جائے۔ ان کے مطالعہ کے ساتھ ہی ان کے خیالات اور قطعیتِ نظر کی طرف توجہ کا منعطف ہونا ضروری تھا۔ فطرتاً اقبال بھی حالی اور اکبر کی قومی اور معاشرتی فضا میں چلنے پھرنے لگے۔ ہر نوعمر انگریزی خواں کی طرح وطن اور قوم کی محبت کے جذبات ان کے دل میں بھی ابھرنے لگے۔ ہندوستانیوں کی جو حرکت انھیں ناگوار معلوم ہوتی، وہ اس کا اظہار کر دیتے تھے۔ عوام کے افعال میں مستقبل کا خیال بہت کم رہتا ہے۔ حالی کی طرح قوم کی غلطیوں سے اقبال بھی اسے مطلع کر دیتے تھے۔ چنانچہ فرقہ وارانہ مناقشات پر ان کا جی جلتا تھا۔

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے

سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قربِ فراق آمیز ہے

بدلے یک رنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب

لذتِ قربِ حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں
اختلاطِ موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

وطن کی فکر ناداں قیامت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

وطنی نظمیں اقبال کی اس قدر مقبول ہوئیں کہ بچے بچے کی زبان پر جڑھی ہوئی ہیں۔ خصوصاً وہ نظم جس کا عنوان "ہندوستان ہمارا ہے"، "صدائے درد"، "ہمالہ" اور "تصویرِ درد" وغیرہ میں بھی وطنیت کا احساس شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

ان نظموں کے علاوہ اقبال کی ابتدائی شاعری کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو مغربی شعراء جیسے ٹینی سن، ایمرسن، گوئٹے وغیرہ کے کلام سے ماخوذ ہے۔ درحقیقت اقبال کی موضوعی نظموں کا اولین نقش ہیں۔ اس دور کے اکثر شعراء جنہوں نے مغربی نظموں کے مقابلہ میں نظمیں لکھنے کی کوشش کی ہے وہ پہلے پہل مغربی شعراء کے کلام کو نمونہ بناتے رہے ہیں۔ ماخوذ خیالات میں اقبال نے عموماً ایسی فلسفیانہ نظمیں انتخاب کی ہیں جو اردو میں آنے کے بعد اس کا ایک جزو معلوم ہونے لگی ہیں۔ یہ تقلید کی بڑی کامیابی ہے یہی نظمیں اقبال نے عموماً بچوں کے لئے لکھی ہیں۔ لیکن وہ اردو ادب میں ایک اضافہ ہیں۔

فطرت کی عکاسی اور قلبی جذبات کے اظہار کے حقیقی اسالیب اردو میں میر حسن، میر انیس، اور نظیر اکبر آبادی کے زمانے سے چلے آ رہے تھے لیکن اس نقطۂ نظر سے ان شعراء کے کلام کو حالی سے پہلے بہت کم اہمیت دی گئی۔ آزاد اور حالی نے جب شاعری کا رخ بدل دیا تو فطرت نگاری

کی اہمیت خواص و عوام پر روشن ہوئی اسمٰعیل میرٹھی نے اردو شاعری کے اس خاص پہلو کو حدِ کمال تک پہنچا دیا۔ اقبال کی شاعری جب شروع ہوئی تو لوگوں کی توجہ قدیم طرز کی شاعری سے ہٹ کر اسی طرح کی فطری شاعری پر جم گئی تھی۔ گو شروع کے ہونے سے یہ میدان اس وقت تک صرف حالی اور اسمٰعیل میرٹھی کی شاعری پر محدود تھا لیکن اقبال کی فطری نظموں نے نہ صرف اس میدان کو وسیع کیا بلکہ آئندہ شعراء کے لئے بے شمار راستے کھول دیے۔ "ہمالہ"، "گلِ رنگین"، "ابرِ کہسار"، "آفتابِ صبح"، "پیامِ صبح"، "چاند"، "صبح کا ستارہ" وغیرہ اقبال کی منظر نگاری کے بہترین نمونے ہیں۔ اسی طرح جذبات کا صحیح مگر شاعرانہ اظہار جس طرح "مرزا غالب"، "داغ"، "تصویرِ درد"، "مختار راہی" میں کیا گیا ہے، ان سے پہلے کی اردو نظموں میں شاید ہی مل سکے۔ خود حالی کی نظمیں اس حیثیت سے بہت معمولی ہیں۔ اسمٰعیل کی منظر نگاری میں اقبال سے زیادہ گھلاوٹ اور سلاست ہے۔ مگر ان میں اقبال کی سی گہرائی نہیں ہے۔

ان تمام خصوصیات کے علاوہ ابتدائی نظموں میں اقبال کا شخصی عنصر اور ذاتی خیالات کی جھلک بھی بے حد موثر ہے۔ فکرِ عمیق کے آثار اقبال کی چھوٹی سے چھوٹی اور سطحی سے سطحی نظم میں صاف ظاہر ہیں۔ اقبال نہ صرف فلسفے کے متعلم ہیں بلکہ اچھے مفکر بھی ہیں۔

اقبال کے اسلوب اور اکبر الٰہ آبادی کے اسلوب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ منظوم ہیں۔ اور وہ متشنج۔ لیکن اقبال کے کلام میں چند ظریفانہ نظمیں بھی ہیں۔ ان کے ماخذ کی تلاش کے لئے اکبر کے کلام کے اثر کی طرف دھیان دینا بے جا نہ ہوگی۔ کوئی وجہ نہیں کہ نوعمر اقبال اکبر کے مقبول طرزِ شاعری

سے کر رہے ہیں۔ ذیل کے اقتباسوں کو کون اکبر کے اثر سے محفوظ خیال کر سکتا ہے۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِ نظر
وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ
دفعِ مرض کے واسطے "پل" پیش کیجئے
تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض
دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجئے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ "بل" پیش کیجئے

اکبر کا یہ اثر اقبال پر بہت ہی نام نہاد ہے۔ اصلی اثر وہ ہے جس سے ان کی شاعری کی اصلی تعمیر میں مدد ملی۔ اردو شاعری کے ارتقا کا یہ وہ رشتہ ہے جو میر سے شروع ہو کر انیس، نظیر، آزاد، حالی اور اسمٰعیل سے گزرتا ہوا اقبال تک پہنچا ہے جس کی ابتدائی کوششوں میں جن شعرا کا جواب دیکھ رہے تھے، وہ درحقیقت اقبال ہی کے محسن آباء ہیں۔

شاعری کا ایک پہلو تزئینی بھی ہوتا ہے۔ شاعروں کے خیالات اقوام کی درستی میں بڑا حصہ لیتے رہے ہیں۔ اس حیثیت سے قدیم اردو شاعری بہت کم اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ وہ قوم کی کسی حالت سے تعرض نہیں کرتی۔ بعض شعرا کے کلام میں اخلاقی نکتے ملتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر تصوف کے ضمن میں ظاہر ہوئے ہیں اور اس قسم کے اشعار اس قدر تھوڑے ہیں کہ ان کا عدم اور وجود برابر ہے۔

گو آزاد جدید شاعری کے سب سے پہلے علمبردار ہیں۔ لیکن انکی نظمیں قومی حالت سے بے تعلق ہونے کی وجہ سے انہیں حالی کے مقابلہ میں عقبی زمین میں ڈال رہی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ تاریخ ادب کے سوا شاعر کی حیثیت سے آزاد کا ذکر آئندہ نسلوں میں بالکل نہ ہو۔ اس کے برخلاف حالی کی شاعری باوجود سیدھی سادی ہونے کے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔ وہ قوم کی زندگی سے وابستہ ہو گئی ہے۔ اس لئے نہ صرف شاعری کے بنیادی خیال میں ایک انقلاب برپا کیا بلکہ موجودہ تعلیم اور معاشرہ کے بہت سے مسائل سے رد و قدح سے اور قوم کے اخلاق و خیالات کی اصلاح کی کوشش کرتی ہے۔ وہ قوم کو بیدار کرتی ہے اور اس کے سامنے ایک نصب العین بھی قائم کرتی ہے۔ یا جیسے بعض وقت کہا گیا کہ۔ حالی کی شاعری کا ایک معین "پیغام" ہے

پھر دم تم ادھر کو جدھر کی ہوا ہو

گویا حالی ایک جدید قوم کی تعمیر کرنے والے ہیں۔ آجکل کی شاعری فروعات میں حالی سے بالکل مختلف ہے۔ لیکن اس کی اصلی اسپرٹ وہی ہے جو حالی کی شاعری کی ہے بلکہ ایک تیز بعض فطرت نگاری میں وہ حالی سے

مشترک بھی ہے۔

اگر قدامت پرست طبیعت کے انسان تھے اس لئے حالی کی جدید تعمیر سے وہ پوری ہمدردی نہیں رکھ سکتے تھے۔ وہ قوم کو غفلت سے بیدار کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کو مغربی تقلید کے غار میں اندھے کی طرح گرتے ہوئے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی اپنی قدیم روایات کو برقرار رکھ کر ترقی کی راہیں اختیار کریں۔ زمانہ کی ہرآن تبدیلی کے ساتھ اپنی حالت کو بدلنا انہیں پسند نہیں تھا۔

ہوس پرستوں کو کیوں یہ کد ہے ان انقلابوں کی کیا سند ہے
اگر زمانہ بدل رہا ہے۔ بدلنے ہی کو بدل رہا ہے

قومی اور وطنی جذبات سے لبریز دل اقبال جب اس اختلاف پر نظر ڈالتے ہیں تو انہیں قوم کی زبوں حالت پر حالی کے ساتھ ماتم کرنا پڑتا ہے ابتدائی دور کی شاعری میں اقبال کے یہاں یہ اثر بہت زیادہ نمایاں ہے لیکن مرض کے علاج کا ان کے پاس کوئی معین نسخہ نہیں ہے۔ اس لئے ہم اس دور کی شاعری کے متعلق یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اپنے اور اپنے ہم قوموں کے لئے کیا راستہ تجویز کرتے ہیں۔ اسی واسطے اس دور کی شاعری کو بعض بزرگوں نے تذبذب، تلاش اور اضطراب کی شاعری بھی کہا ہے۔ اقبال کی طبیعت کا یہ انتشار نہ صرف قومی نظموں سے ظاہر ہے، بلکہ دوسری نظمیں بھی اس سے خالی نہیں ہیں۔ "شمع" "خفتگان خاک سے استفسار" "شمع اور پروانہ" وغیرہ سے بخصوصیت صرف ظاہر ہے حقیقت جو شے دنیا کی ہر شے کی ماہیت دریافت

کرنا چاہتا ہے لیکن ابھی فطرت کے راز اس کی سمجھ سے بالا معلوم ہوتے ہیں آخرش وہ پریشان ہو کر کہنے لگتا ہے

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یا رب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

پھر وہ خدا سے دعا کرتا ہے کہ یہ رازہائے فطرت جو اس کے لئے معمہ ہیں اس پر منکشف ہو جائیں۔

لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو

گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو

مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل
ننھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو

بعد کے دور کی نظموں کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو عشق کی تلاش تھی جس کے بغیر زندگی بے لطف ہو رہی تھی۔ تنہائی میں اور مجمعے میں غرض ہر جگہ وہ اپنے آپ کو اجنبی پاتا ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی نصب العین ابھی تک متعین نہیں ہوا جس کیلئے وہ بے چین ہے۔

یہ انتشار یورپ میں جانے کے بعد رفع ہو جاتا ہے اور شاعر وہاں سے آئندہ کے لئے ایک تجویز سوچ کر وطن واپس آتا ہے۔

غرض اس دور میں اقبال بحیثیت وطن پرست شاعر ہے قومی نظموں سے ہٹ کر انہوں نے جو نظمیں اس دور میں لکھیں وہ بھی بلند پایہ ہیں۔ ان کا آئندہ اعلیٰ فلسفیانہ اور صوفیانہ کردار ان نظموں میں ہر رنگ نمایاں ہے۔ گل رنگیں، "خفتگان خاک سے استفسار"

"شمع" "ماہِ نو" "انسان اور بزمِ قدرت" "بچہ اور شمع" وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں شاعر نے کائنات کے اہم بالشان مسائل جیسے حیات، حیات کے ماخذ، حیات کا مقصد، انجامِ حیات اور حیات بعد الموت اور عشق اور حسن وغیرہ سے بحث کی ہے ان میں سے ہر ایک کی تہ تک پہنچنے کی وہ کوشش کرتے ہیں کہیں تو وہ ہیں عالمِ صغیر یعنے انسان اور اس کی قوتوں پر غور کرتے ہیں کہیں وہ انسان اور بیرونی کائنات کو بالمقابل رکھ کر دونوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ کہیں انسان کی ہنگامہ آرائی اور فطرت کی خاموش کارگزاری میں بڑا فرق نظر آتا ہے جس چیز کی ماہیت کو سمجھنے سے وہ قاصر رہ جاتے ہیں اس کے لیے خدا سے استعانت طلب کرتے ہیں۔

یہ دور "التجائے مسافر" پر ختم ہو جاتا ہے جس نظم میں شاعر نے اپنے علمی نصب العین کے حصول میں استقلال کی اس درگاہ سے دعا مانگی ہے۔

اقبال کی شاعری کا دوسرا دور قیامِ یورپ کا ہے۔ یورپ میں اقبال کا زمانہ بہت مصروف گزرا۔ ایک طرف تو وہ علمی سرمایہ کو سمیٹ رہے تھے دوسری طرف یورپ کی معاشرت، تمدن اور سیاست پر بھی ان کی نظر جمی ہوئی تھی ان کا مضمون چونکہ اسلامی فلسفہ اور خاص کر ایرانی فلسفہ تھا اس لئے ان کی طبیعت میں پہلے سے عربی اور فارسی سے خاص لگاؤ تھا اس مضمون میں خوب فکر ہوئی۔

یورپ میں اقبال کی شاعری کا جو زاویۂ نظر بدلا اس کے بے شمار قدرتی اسباب ہیں۔ پہلے تو یہ کہ فطری لگاؤ کی وجہ سے مقالے کے لئے جو موضوع اختیار کیا وہ ان کو اسلامی فلسفہ سے بخوبی روشناس کروانے والا تھا۔ دوسری اتفاقی بات یہ ہے کہ اقبال کو اپنی فارسی زبان پر قدرت کا انکشاف یہیں ہوا۔ تیسرے انھوں نے یورپ کی معاشرت کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس کا اثر

یہ ہوا کہ اگر اس سے پہلے اُن کے خیالات یورپ کو اپنا نمونہ بنانے کے تھے تو وہ بدل گئے۔ یہ چوتھی چیز یہ ہے کہ پہلے وہ صرف ہندوستانی اور خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کے شاعر تھے۔ ہندوستان سے باہر نکل کر انھوں نے جب تمام عالمِ اسلامی پر ایک عام مصیبت کو مسلّط دیکھا تو ان کی ہمدردی تیز ہوگئی۔

اسلامی فلسفے کی تحقیق نے اقبال کو حقیقی اسلام اس کے سادہ ترین اور مہتم بالشان اصولِ زندگی اس کے وسیع نظر اور اگلے مسلمانوں کی عظمت سے کماحقہٗ روشناس کر دیا۔ اگلی عظمت کے مقابلہ میں موجودہ مصیبت کو دیکھ کر ان کے ہمدردانہ جذبات میں تحریک پیدا ہوئی اور انھیں یہیں سے آئندہ تخیل کا موضوع مل گیا۔ پہلے اقبال کا یہ خیال تھا کہ مسلمان وطن پرست بھی ہو سکتے ہیں لیکن اب یہ خیال کمزور پڑ گیا خصوصاً اس لیے بھی کہ ہندوستانیوں میں جو خیالی تفریق پیدا ہو گئی تھی، وہ دُور ہوتی ہی نظر نہیں آ رہی تھی۔
یہ ہندو فرقہ سازانہ اقبال آخری کر رہ گیا بجائے اس کے انھوں نے اپنا خیال دوبارہ جمایا اس بے سود کام پر اپنی ہمت ضائع کرنے کو انھوں نے فضول سمجھا۔ اس کی بجائے بالواسطہ طریقوں سے مسلمانوں میں رواداری کا احساس پیدا کرنے کی کوشش شروع کی۔ کیونکہ نصیحت براہِ راست بہت زبوں کوش ہوتی ہے اس کے علاوہ اس تبدیلیِ خیال میں یہ نکتہ بھی مضمر تھا کہ جب تک قومیں کسی اعلیٰ نصب العین کے حصول میں سرگرم نہ ہوں، وہ اختلافات کے خیالات ہی کو میدانِ عمل کی کھیتی سمجھتی ہیں۔

اب دقت یہ تھی کہ اردو جو ہندوستان کی زبان ہے صرف ہندوستان ہی تک محدود ہے۔ بیرونی مسلمانوں تک اس کی رسائی ناممکن ہے۔ اس مشکل

انھیں اتفاقاً مزہ آگیا تھا۔ فارسی میں بھی بآسانی سے شعر لکھنے لگے تھے۔ اس لیے انھوں نے فارسی زبان کو اپنی شاعری کا ذریعہ بنالیا تاکہ مسلمانوں کا زیادہ وسیع حصہ اس کو پڑھ سکے۔ یورپ سے لوٹنے کے بعد زیادہ توجہ اقبال نے فارسی شاعری پر صرف کی گو اردو میں بھی وہ برابر لکھتے رہے۔

یورپ کی سیاسی اور معاشرتی حالت کے مشاہدے اور مطالعہ نے اقبال کو ان کی خامیوں سے واقف کیا۔ یورپ کی سیاست جس قدر پیچیدہ ہے اس سے زیادہ سقیم بھی ہے پیچیدگی یہ ہے کہ ان اقوام کا جو اصول ہے، اس پر ان کا عمل نہیں اور جب اصول اور عمل دونوں موجود ہوں تو ان میں جدا نہیں۔ یورپی قومیں آزاد اپنے آپ کو اسی وقت سمجھتی ہیں جبکہ ان کا کوئی غلام ہو اور دوسری قوم کی عزت اسی وقت کرتی ہیں جب وہ اس سے ڈریں ان کی سیاست کی بنیاد اس پر ہے کہ جس قدر ممکن ہو مادی اور سائنس کے وسائل سے دنیا کی دوسری قوموں کو تباہ اور برباد کر دیا جائے تاکہ ان کا بول بالا ہو معاشرتی حالت میں جو اسقام ہیں ان کا تفصیلی ذکر ایک کتاب چاہتا ہے۔ سرمایہ دار اپنے ہی ہم جنس اور ہم قوم غریبوں اور مزدوروں کا خون چوسنے کے لیے بیٹھے ہیں۔ ادنیٰ طبقے زندگی کی کم سے کم ضروریات کے لیے بھی وہ اسی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ سرمایہ دار کو اپنے عیش و آرام سے سیری ہی نہیں ہوتی۔ پھر ان اقوام میں ظاہر پرستیاں ایسی ہیں کہ جن کی زندگی کے لیے قطعاً ضرورت نہیں سب سے بڑھ کر یہ کہ یورپ اپنے سائنس اور دوسرے مادی وسائل کی وجہ سے دنیا کو خدمت کے بجائے تباہ کر رہا ہے۔

جب اقبال دنیا کی راہنما قوموں کی حالت سے مایوس ہوگئے تو انھیں مجبوراً صدر اسلام کی زندگی کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اسلام کے وسیع اصول

مساوات، حریت اور اخوت اور ان پر سختی کے ساتھ عمل پیرا ہونے ہی میں اقبال
کو نجات نظر آنے لگی۔ اسلام ہی کا نظام معاشرت ان کیلئے اب دارالامان باقی
رہ گیا تھا۔ فطرتاً وہ ادھر متوجہ ہو گئے۔ ان کے دل میں مقصدِ حیات کا جو
احساس پیدا ہو گیا تھا وہ مطمئن ہو گیا کیونکہ بنی نوع انسان کی فلاح کا خیال
پختہ ہو گیا۔ اب وہ تمام عالم میں کسی کو اپنا و غیر ہی نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ ان کا
دارالامان سب کے لئے تھا۔ گویا "عشق کی چنگاری جو ان کے دل میں فروزاں
ہوئی تھی بھڑک کر شعلہ بن گئی۔ اب وہ تذبذب جاتا رہا۔ اور متلاشیِ حقیقت کو
حقیقت کا پتہ لگ گیا۔

عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تپش سے آشنا
بزم کو مثلِ شمعِ بزم حاصلِ سوز و ساز دے
تارے میں وہ قمر میں وہ جلوہ گہِ سحر میں وہ
چشمِ نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے

یہ خیالات درحقیقت الہامِ ربانی سے کم نہیں ہیں۔ آگے چل کر
وہ صاف طور سے بیان کرتے ہیں۔ یہ عشق جس کی دنیا کو ضرورت ہے یورپ
سے نہیں مل سکتا۔

پیرِ مغاں فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ کیفِ غم نہیں مجھ کو تو خانہ ساز دے
تجھ کو خبر نہیں ہے کیا بزمِ کہن بدل گئی
اب نہ خدا کے واسطے ان کو مئے مجاز دے

یہی پیامِ محبت انھوں نے یورپ سے علی گڑھ کالج کے طلبہ کے
نام بھیجا تھا۔

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

آتی تھی کوہ سے صدا رازِ حیات ہے سکوں
کہتا تھا مورِ ناتواں لطفِ خرام اور ہے

جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمنِ حجاز کا
اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے

موت ہے عیشِ جاوداں ذوقِ طلب اگر نہ ہو
گردشِ آدمی ہے اور گردشِ جام اور ہے

بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خم کے سر پہ تم خشتِ کلیسا ابھی

۱۹۰۷ء میں ایک غزل اقبال نے لکھی تھی اس میں اپنے زاویۂ نظر کی تبدیلی اور حقیقتِ حال کے آشکار ہونے کی تفہیم عجب شگفتہ انداز میں کی ہے ۔

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

سنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا
سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

اسی غزل میں اپنی عالم دوستی کا اظہار یوں کیا ہے ۔

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

نظر اس قدر وسیع ہو جانے کے بعد اقبال کے ذہن سے وطنیت کا خیال بھی نکل جانا ضروری تھا۔

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے
کہاں کا آنا کہاں کا جانا فریب ہے امتیازِ عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے ہماری کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

انہیں خیالات کو انہوں نے بعد کی ایک فارسی نظم میں بھی ظاہر کیا جو "پیامِ مشرق" میں شائع ہوئی ہے ۔

از من اے بادِ صبا گوئے بہ دانائے فرنگ
عقل تا بال کشودہ است گرفتار تر است
برق را ایں بجگر می زند آں رام کند
عشق از عقلِ فسوں پیشہ جگردار تر است
کیمیا سازی و ز ریگ روان زر گرد
بہ دل سوختہ اکسیر محبت کم کرد

وائے بر سادگی ما کہ فسونش خوردیم
رہزنی بود کمیں کردہ و آدم زد

ہر نفس خاک برآورد ز تہذیب فرنگ
باز آں خاک بچشم پسر مریم زد

رزم و بزم من پسندیدہ و جائے آراست
تیغ او مہر بکشد سینہ یاران بشکست

رہزنی ہا کہ بنا کرد جہاں باقی گشت
تخم خواہش او ہمہ بیندہ و شکست

گو اقبال مغربی تہذیب سے مایوس ہو گئے تھے لیکن انہوں نے یورپ کے اکثر علمی بزرگوں پر نظمیں لکھیں۔ اشتراکی کارل مارکس، ہیگل، آئن سٹائن، بائرن، پیٹوفی، آکسن، کانٹ، گوئٹے، برگساں، لاک، کومٹے، براؤننگ، شیکسپیئر وغیرہ میں سے جس کسی کی تعریف کی ہے اس قدر دل کھول کر کی ہے کہ ان کی وسیع النظری کا اس سے پتہ چل جاتا ہے۔

اس دور میں اقبال کی ذہنیت کس قدر پختہ ہو گئی تھی اس کا ثبوت بانگ درا کی نظم سے ملتا ہے جس کا عنوان "محبت" ہے۔ یہ نظم محبت کے اجزائے ترکیبی سے آگاہی حاصل ہونے یا دوسرے الفاظ میں عشق کی حقیقی ماہیت سے واقف ہونے کے بعد لکھی گئی ہے۔ حقیقت حسن کو بھی وہ اب سمجھ جاتے ہیں۔

ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی

ان حقائق کے انکشاف کے بعد وہ دنیا کو اپنا پیام سناتے ہیں۔

عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تپش سے آشنا
بزم کو مثلِ شمع بزم حاصلِ سوز و ساز دے

شانِ کرم پہ ہے مدار عشقِ گرہ کشاے
دیر و حرم کی قید کیا جس کو وہ بے نیاز دے

صورتِ شمع نور کی ملتی نہیں قبا اُسے
جس کو خدا نہ دہر میں گریۂ جاں گداز دے

"تارے میں وہ قمر میں وہ جلوہ گہِ سحر میں وہ
چشمِ نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے

عشق بلند بال ہے رسم و رہِ نیاز سے
حسن ہے مستِ ناز اگر تو بھی جوابِ ناز دے

ان نظموں اور ذیل کی نظم سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی سعی کا محور بدل گیا لیکن ان کا مذہب وہی باقی رہا جو پہلے تھا۔ اگر بدلا تو رنگ لیکے امتیاز یا مسالک و عقائد کے اختلاف پر مبنی نہیں بلکہ یہ مذہب بسیط عشق ہے۔ مذہب یا عقائد کے لحاظ سے وہ کسی کے دوست ہیں نہ دشمن۔ عقائد میں وہ صوفی ہیں۔ اور نظامِ معاشرت میں مسلمان۔

شانِ کرم پہ ہے مدار عشقِ گرہ کشاے کی
دیر و حرم کی قید کیا جس کو وہ بے نیاز دے

اسی خیال کو سوامی رام تیرتھ کے عنوان کی نظم میں اس طرح ادا کیا ہے۔

نفی ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

توڑ دیتا ہے بت ہستی کو ابراہیم عشق
ہوش کا دارو ہے گویا مستی تسنیم عشق

ان کی حقیقت شناس نظر نے یورپ سے بھی کئی مفید باتیں اخذ کیں ان میں سب سے نمایاں "پیغام عمل" ہے جو یورپی اقوام کا بڑا سرمایہ امتیاز ہے اس کی تلقین ہر جگہ فارسی اور اردو شاعری میں کرتے ہیں۔

مرا صاحبدلے این نکتہ آموخت
ز منزل جادہ پیچیدہ خوشتر

بہائے علم تا اندر جہان است
یقیں کم کن گرفتار شکے باش
عمل خواہی؟ یقیں را پختہ تر کن
یکے جوئے و یکے بین و یکے باش

پختہ تر ہے گردش پیہم سے جام زندگی
ہے یہی اے بے خبر راز دوام زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سر آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

یورپ سے نکلتے ہوئے اقبال نے جو معرکۃ الآرا نظم "سر شیخ عبدالقادر" کے نام لکھی ہے وہ گویا اس دور کی شاعری کا لب لباب اور آئندہ دور کی شاعری کا پیش نامہ ہے۔ اس نظم کے لب ولہجہ کی بلندی کو دیکھ کر گرامی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

درِ دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

اقبال کی شاعری کا آخری دور ۱۹۰۸ء کے بعد کا ہے۔ اسی سنہ میں وہ ہندوستان واپس ہوئے۔ یہ دور در حقیقت اقبال کی شاعری کا زرین دور ہے۔ اس دور کی شاعری نے اقبال کے لئے دُنیا کے لازوال شعراء کے زمرہ میں جگہ نکال لی ہے اور اس دور کی شاعری ہی اقبال کی زندگی کا ماحصل اور ان کی شعری کوششوں کا منتہا ہے۔

اس دور کی شاعری کی تمہید بہت تھوڑی ہے کیونکہ اس کا بیشتر حصہ دوسرے دور کے ضمن میں گزر چکا ہے۔

اقبال نے یورپ میں جو بلند شاعری کا پیدا کیا تھا اب وہ عملی صورت اختیار کرنے لگا۔ ان کی ہمدردی کائنات کے ہر اُس ذرہ کے ساتھ تھی جو مصیبت میں ہو۔

من دریں خاکِ کہن گوہرِ جاں می بینم
چشمِ ہر ذرہ چو انجم نگراں می بینم
دانہ را کہ بہ آغوشِ زمیں است ہنوز
شاخ در شاخ و برومند و جواں می بینم (پیامِ مشرق)

ان کا مذہب و مسلک صوفیانہ جیسے عشق و محبت تھا۔ ایسا عشق جو کائنات کے ہر ذرہ کے ساتھ ہو، ہر ذی حیات کے ساتھ ہو، ہر فردِ بشر کے ساتھ ہو اور حسن و حیات کے مخرج کے ساتھ ہو۔ اسی لئے اس دور کی شاعری میں "عشق" کی تلقین بڑے شد و مد کے ساتھ کی ہے بلکہ عشق ہی ان کے دونوں عالم کا محور نظر آتا ہے۔ کائنات کے ہر ذرہ کو دوسرے ذرہ

کے ساتھ عشق ہے۔ اس لئے زندگی حیات کو وہ بدتر از موت تصور کرتے ہیں جس میں عشق کی چمک نہ ہو۔ جس طرح قدیم شعرائے اردو نے عشق کیا تھا وحشت یعنے حرکت کو ضروری سمجھا تھا۔ یہی حرکت یعنے عمل کو ضروری تصور کرتے ہیں۔ عشق تو ایک مذہب ہے اور اس کے ارکان عمل کے ذریعہ ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ آخری ترمیم گویا اقبال کا اپنا اضافہ ہے۔

آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں
کہتا تھا مور ناتواں لطف خرام اور ہے

راز حیات پوچھ لے خضر خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

عمل کا میدان وہ صدر اسلام کے اصول کو بتلاتے ہیں۔ شاعر کے عقیدے میں یہی دنیا کی موجودہ کشمکش کا حل ہو سکتا ہے اور یہی دنیا کے لئے دارالامان بن سکتا ہے۔

خضر کا پیغام کیا ہے؟ یہ پیام کائنات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے
سُکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی دستور ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کی تجلی زار میں آباد ہو

اس آخری دور میں اقبال کی اردو شاعری فارسی شاعری کے مقابلہ میں کم رہ گئی۔ تاہم اردو شاعری فارسی شاعری کا تتمہ رہی۔ فارسی شاعری کی پوری اسپرٹ اس میں موجود ہے۔ فارسی شاعری کے آغاز اور اس کی طرف زیادہ تر توجہ کے اسباب ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ لیکن ایک چیز جو یہاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہے وہ یہ ہے کہ اقبال نے ایرانی فلسفہ کی جو تحقیقات کی تھیں، اس سے انھیں بڑی مدد آئندہ فارسی شاعری میں ملی۔ اپنے مضمون کے لئے انھیں یوں تو سارے مسلمان فلسفیوں کے کارنامے پڑھنے پڑے لیکن وہ مولانا روم سے بے حد متاثر ہوئے۔ اقبال کے آخری کلام پر مولانا روم کے فلسفہ ہی کا اثر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی ذہنیت کو معراجِ کمال پر پہنچانے والا رومی ہی کا کلام ہے۔ جو "مثنوی معنوی" اور "دیوان شمس تبریز" جیسی دو بے حد ضخیم کتابوں پر مشتمل ہے۔ اقبال کا تصوف، ان کی نظر افروزی، وسعتِ جذبات، حیات کے رازوں سے آگاہی، کائنات کے ساتھ انس، محبت اور عشق، غرض پوری شاعری کا ڈھانچہ، وہ بڑی حد تک حضرت رومی ہی کا ممنونِ احسان ہے۔ اقبال نے خود اس کا جابجا اعتراف کیا ہے۔

بوی گل شد دم شبنم بناخن چنگ
عقده های حکیم المانی
آنکه اندیشه اش برهنه نمود
ابکری را ز کسوت آنی
جنبش موج خیال او گیتی
خجل آمد ز تنگ دامانی
چون بدریای او فرو رفتیم
کشتی عقل گشت طوفانی
خواب بردم دمیده افسونش
چشم بستم ز باقی و فانی
بشوق تیزتر گردید
چهره بنمود پیر یزدانی
آفتابی که از تجلی او
افق روم و شام نورانی
شعله اش در جهان تیره نهاد
به بیابان چراغ رهبانی
معنی از حرف او همی روید
صفت لاله های نعمانی
گفت با من چه خفته برخیز
بسر آب سفینه رانی

زخمہ ور او عشق ہی ہوئی
پہ چراغ آفتاب ہی جولی (بال جبریل)

عشق است کہ در جانت ہر کیفیت انگیزد
از تاب و تب رومی تا حیرت فارابی
مرشد رومی حکیم پاک زاد
سرِ مرگ و زندگی بر ما کشاد (پیام مشرق)

اقبال پر رومی کا اس قدر زبردست اثر تھا کہ انھوں نے اپنی مثنوی "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" کی بنیاد ہی "مثنوی معنوی" کی طرز پر رکھی ہے۔ دونوں مثنویوں کی بحر وہی ہے اور اسلوب وہی۔ آغاز بھی مثنوی ہی کے اشعار سے ہوتا ہے۔ مولانا روم کا اثر اقبال پر بہت قدیم ہے۔ چنانچہ پہلے دور کی نظموں میں بھی اس اثر کا سراغ ملتا ہے۔

پنہاں دروں سینہ کہیں راز ہو ترا
اشک جگر گداز نہ غماز ہو ترا

گویا زبان شاعر رنگیں بیاں نہ ہو
آواز "نے" میں شکوۂ فرقت نہاں نہ ہو

میری مانند تو بھی اک برگ ریاض طور ہے
میں چمن سے دور ہوں تو بھی چمن سے دور ہے

"نے" "شکوۂ فرقت" "برگ ریاض طور" اور "چمن" اسی "نیستان" کی طرف اشارہ ہے، جو مثنوی معنوی کے پہلے ہی شعر میں ہے۔

نہ صرف یہ بلکہ اقبال کا جو عظیم الشان فلسفہ "خودی" بھی مولانا ہی سے

متاثر ہے مجموعی طور پر اس کے بموجب جب انسان اپنی حقیقت سے واقف ہو جاتا ہے یا اپنی اَنا کو مضبوط کر دیتا ہے تو دونوں صورتوں میں اس کی قوت و عظمت ہو جاتی ہے۔ اس حالت میں کائنات پر حکومت کرنا بھی اس کے لئے ایک معمولی بات ہے۔ لیکن اس خودی کے احساس سے اقبال نے جو کام لیا ہے وہ ان کا اپنا قابلِ قدر کارنامہ ہے۔ جس کا تعلق بڑی حد تک ہماری موجودہ حالت اور ضرورت سے ہے۔

اقبال نے اب تک جس قدر فارسی نظمیں لکھی ہیں وہ چار کتابوں کی صورت میں شائع ہوئی ہیں (۱) زبورِ عجم (۲) اسرارِ خودی (۳) رموزِ بے خودی (۴) پیامِ مشرق۔ ان میں سے آخری تین بے حد اہم ہیں۔ پیامِ مشرق میں ایک طویل نظم کے علاوہ کئی چھوٹی چھوٹی متفرق نظمیں بھی شامل ہیں۔ یہ سب نظمیں بلند پایہ ہیں۔ "پیامِ مشرق" کے ذریعہ اقبال نے مغرب کے لئے مشرق کا تحفہ بھیجا ہے۔ یہ المانوی شاعر گوئٹے کے دیوان کا جواب ہے جو مغربی دیوان کے نام سے شائع ہوا تھا۔

"رموزِ بے خودی" میں ملّتِ اسلامی کے ارکان سے بحث کی ہے لیکن "اسرارِ خودی" محکوم اقوام کے لئے بڑی اہم نظم ہے۔ بظاہر یہ متصوفانہ معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں یہ محکوم اقوام کی اصلاح خونریت کا ہتھیار ہے۔ اس میں حاکم اور محکوم ذہنیتوں کا فرق بڑی حکیمانہ قابلیت سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کا اصلی مقصد اس پستی کو دور کرنا ہے جو محکوم اقوام کے حالات کی وجہ سے ان کی ذہنیتوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ نظم اقبال کی اکثر نظموں کی طرح بے حد اور بجلی خیالات پر مشتمل ہے۔

اس دور کی اردو نظموں میں چار یا پانچ بڑی اور باقی چھوٹی نظمیں ہیں

ان میں اکثر نظموں کا تعلق مسلمانوں کی موجودہ حالت سے ہے۔ تمام نظموں کو ہم ذیل کے چار عنوانات کے تحت تقسیم کر سکتے ہیں:

(۱) قومی اور وطنی۔ (۲) معاشرتی اور اخلاقی۔
(۳) حکیمانہ۔ (۴) ہنگامی۔

قومی اور وطنی نظموں میں بڑی اور معرکتہ الآرا نظمیں "شکوہ"، "جواب شکوہ"، "خضرِ راہ" اور "طلوعِ اسلام" ہیں۔ ان کے علاوہ کئی مختصر نظمیں جیسے "ترانۂ ملی"، "وطنیت"، "خطاب بہ نوجوانانِ اسلام"، "مسلم" خاص طور سے توجہ طلب ہیں۔ ان کے متعلق کچھ زیادہ کہنا نہیں ہے۔ ہر نظم قومی جذبہ میں حقیقی معنوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔ جن الفاظ سے قوم کو جگانے کی کوشش کی گئی ہے اعجاز معلوم ہوتا ہے۔ "ترانۂ ملی" اور "وطنیت" دورِ اول کی اسی موضوع کی نظموں کی توسیع یا ترمیم ہے۔ پہلے دور میں اقبال نے کہا تھا ؂

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اب اس میں یہ ترمیم کی گئی۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اس اختلاف کی توجیہ وہ خود اس طرح کرتے ہیں

تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

نیز "بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے"

"شکوہ"، "جواب شکوہ"، "خضرِ راہ" اور "طلوعِ اسلام" جیسی کسی نظم کا جواب اردو میں نہیں ملتا۔ "شکوہ" اور "جواب شکوہ" میں جس شاعرانہ انداز سے مسلمانوں کی پستی کا شکوہ خدا سے کیا ہے اور جیسی ترقی کی ترکیب بتلائی ہے وہ زبانِ الہام کی شان رکھتی ہے۔ یہ نظمیں اقبال کی

محسوس کرا رہی ہیں

معاشرتی اور اخلاقی نظموں کے تحت وہ تمام نظمیں آجاتی ہیں جو تہذیب یا تعلیم پر ہیں یا کسی متعلق مضمون پر لکھی گئی ہیں۔ یہی وہ نظمیں ہیں جو بالکل اکبر الہ آبادی کے نقطۂ نظر کو پیش کرتی ہیں۔ اس دور کی اہم ترین نظمیں اقبال کی حکیمانہ فلسفیانہ و شعورانہ نظمیں ہیں ان میں اقبال کا اصلی رنگ جس قدر جھلکتا ہے ایسے کسی اور عنوان کی نظموں میں نہیں۔ تاریخی نظمیں اقبال کی اسی وسیع نظری کا ثبوت ہیں۔ جن کا وہ تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں گو اسلامی تاریخ سے متعلق نظمیں زیادہ ہیں لیکن حقیقت میں تخصیص کسی کی نہیں۔ تاریخ کا جو اہم پہلو شاعر کو متاثر کرتا اور اس پر خیال آرائی کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ ان میں حضرت صدیق اکبر پر ایک نظم ہے تو دوسری رام چندر جی پر ہے۔ یہ نظمیں گویا شاعر کے تاریخی تاثرات کی یادگار ہیں۔

آخر میں اقبال کی شاعری کی ادبیت کے متعلق بھی چند الفاظ ضروری ہیں کیونکہ شاعری میں "کمالِ فن" اور "تخیل" کے ساتھ ساتھ جب تک زبان پر پوری قدرت حاصل نہ ہو "حسنِ گویائی" پیدا نہیں ہو سکتا۔ زبان اور خیال دونوں شعر کے لیے ویسے ہی ضروری و لازم ہیں جیسے جان کے لیے قالب۔ بلکہ شعر میں زبان کا جزو اس سے زیادہ اہم ہے کیونکہ یہ ممکن ہے ایک اعلیٰ فہم اور ذکی شخص بیان کے جمالِ فن کو نقصان یعنی اس کی عظمت پر کوئی اثر نہ ہونے دے۔ لیکن بہترین خیالات بھی محسوس ہوں جب تک وہ بہترین اسلوب میں ادا نہ کیے جائیں ادب میں رواج حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی لیے بعض نقادوں نے شعر کی یہ تعریف مقرر کی ہے کہ بہترین خیالات بہترین الفاظ میں ادا کیے جائیں۔"

بعض اردو رسالوں نے اقبال کی زبان پر فرضی تنقیدیں شائع

کی تحسین۔ ظاہر ہے کہ ایسے رسالوں نے اقبال کے ان اشعار کو تنقید کے لیے انتخاب کیا جن میں روزمرہ یا محاورہ کے لحاظ سے کوئی خامی نظر آئی تھی۔ بعض بزرگوں نے اقبال کی توجہ فارسی شاعری کی طرف زیادہ دیکھ کر اس کی توجیہہ یہ فرمائی کہ اُردو رسائل میں اسی طرح کی مضحکہ خیز تنقیدوں نے اقبال کو اردو شاعری سے بددل کر دیا ہے لیکن اقبال کی ذہنیت والے شاعر کے متعلق یہ خیال زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ ہم نے پہلے ہی فارسی شاعری پر اقبال کے زیادہ ہمت صرف کرنے کا سبب بتلا دیا ہے۔

اقبال کی شاعری کے اس پہلو پر غور کرتے وقت تنقید نگار کو کئی امور کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ اقبال کا پورا فارسی کلام سلاست اور روانی کے ایک ہی اعلیٰ معیار پر نہ ہو اور یہ ہو ہی نہیں سکتا یا اس کے ہر شعر میں حافظ کی سی شیرینی اور سعدی کی سادگی اور صفائی موجود نہ ہو۔ لیکن اس سے ان کی عظمت پر کیا حرف آسکتا ہے جبکہ خود مولانا روم جیسے شاعر کا پورا کلام خوبی کے ایک ہی معیار پر نہیں ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ مولانا روم کو بھی بعض جگہ محاورے اور روزمرہ کی پابندی سے ہاتھ دھونا پڑا ہے۔ اردو کلام پر اعتراضات کا بھی یہی جواب ہے۔ اردو میں میر اور سودا جیسے قدیم شاعروں کو چھوڑ کر جن کی مہارت تو متاخرین کے لیے نمونہ تھی انہیں سے لے کر حالی تک بھی کسی شاعر کا کلام اعتراضات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اور ان کے پرستار بھی اکثر اعتراضات کو دور کرنے کے بعد بھی خامیوں کے واضح کرنے سے رک گئے۔ اقبال کا کلام پھر کس طرح خطا سے پاک رہ سکتا ہے؟ ایک بڑے نقاد نے سچ کہا ہے کہ شعر ہی کسی کا زمانے کے انسانی ہونے کی دلیل ہے

فارسی کی طرح اردو میں بھی غزل کی زبان اس قدر منجھ گئی ہے کہ کسی غزل گو شاعر کو زبان کی تمام پابندیوں کا لحاظ رکھنے میں دقت نہیں ہوتی اور جو

لوگ خیال کو قربان کر کے صرف زبان کا غلام بننا اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ وہ ایسی چیز سے کسی کو پنپتے دیکھنا ہی نہیں چاہتے حالانکہ تغزل کے علاوہ دوسری شاعری کا اصول ہی جدا ہے۔ خاص کر اس شاعر کے لیے جس کا مطمحِ نظر مضمون، موضوع اور خیال کی اہمیت ہے، زبان کی بعض غیر اہم بندشوں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ اگر ٹینیسن قدیم زمانے کا شاعر تھا تو براؤننگ جیسے جدید شاعر کے خیالات بھی بعض وقت زبان کی پابندیوں کو توڑ کر باہر نکل جاتے ہیں۔ انگریزی کی طرح فارسی اور اردو شاعری پر بھی ایک دور لفظی صناعی کا گزرا ہے۔ اس زمانے کے لسانی معیار کو سامنے رکھیں تو یقیناً بعد کے شاعروں کا کلام کہیں کہیں پھیکا یا سقیم نظر آنے لگا۔ انتقاد کو ہر حال میں لفظ پرستی ہی نہ بن جانا چاہیے بلکہ حقائق بھی اس کے پیشِ نظر رہیں۔

فارسی اور اردو دونوں میں اقبال کا کلام ایک قابلِ قدر اضافہ ہے خواہ زبان کی حیثیت سے ہو یا مضامین کی۔ فارسی زبان میں اقبال نے اپنے زمانے کی ضروریات سے متعلق بہت سی اہم اصطلاحات، الفاظ اور ترکیبوں کا اضافہ کیا۔ اس زمانے میں جبکہ نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران میں بھی شاعری قدما کے معیار سے بالکل مختلف اور جدید الفاظ اور ترکیبوں کا مرکب بن گئی ہے، اقبال نے قدما کے معیارِ زبان ہی کو ہر جگہ برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے کلام کو پڑھ کر اکثر جگہ کسی قدیم شاعر کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔ یہی چیز ہے جو اقبال کو اپنے زمانے کا بڑا فارسی شاعر بنا رہی ہے۔

اردو زبان کی جو خدمت اقبال کی شاعری انجام دیتی ہے، وہ فارسی سے زیادہ عظیم الشان ہے۔ غالب کی غزلوں کو چھوڑ کر اردو میں سوائے اقبال کے کوئی شاعر ایسا موجود نہیں ہے جس کے کلام میں اعلیٰ خیالات بھی ہوں اور پاکیزہ زبان بھی۔ اقبال کے کلام کے مقابلے میں آزاد اور خود حالی کے کلام میں بھی شعریت

اور وہ بہت کم معلوم ہوتی ہے۔ اقبال کی شاعری کو میرؔ، سوداؔ، دردؔ، مصحفیؔ، میر انیسؔ، ذوقؔ، مرزا غالبؔ اور داغؔ کے معیار سے جانچنا ہی ظلم ہے۔ اقبال کا میدان اپنا جدا ہے جس کے وہ تنہا مالک ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کی جو دنیا پیدا کی ہے، اس کے لوازم حسن، صرف محاورہ، بندش اور روزمرہ نہیں ہیں۔ اقبال نے اردو میں کتنے نئے اور خوبصورت الفاظ دیے ہیں، جتنی ادبی ترکیبیں وضع کی ہیں اور نفیس تشبیہیں اور استعاروں کا جس قدر ذخیرہ فراہم کردیا ہے، اس کی تفصیل کی اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔

غلام محمد
بی۔ اے (عثمانیہ)

کلامِ اقبال کا تحلیلی مطالعہ

"خداوندانِ مکتب" سے اقبال کی شکایت بجا تھی[1]۔ کیا آج بھی خود ان کے کلام کو "درسِ خاکبازی" کا آلۂ کار بنایا نہیں جا رہا ہے؟ — کسی کی فہمِ نارسا نے "بہار" کے دامن میں ایک "خارِ خشک" تعمیر کر کے "قومیتِ متحدہ" کے گن گانے کو کلامِ اقبال کا منشا[2] اصلی تصور کیا — کسی کی خیرہ نگاہیں اقبال کے انقلاب کی صحیح روشنی سے فیضیاب نہ ہو سکیں اور "ثبات" ایک

---

[1] ملاحظہ ہو بالِ جبریل سے

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

[2] اس مقالہ کو انٹرمیڈیٹ کالج کے استاد ادبیاتِ اردو مولوی ناصر حسین صاحب نے یومِ اقبال منعقدہ ۳ شعبان ۱۳۶۰ء بمقام ... میں پڑھا تھا۔

تغیر کو ہے زمانے میں" مراد اسی قسم کا انقلاب بھی ہے جیسا کہ ذہن میں پیدا کیا گیا۔ غرض جتنے اس قسم کے "خداوندانِ مکتب" ہیں اتنی ہی "خانہ آبادی" کی تاویلات بھی کی جاتی ہیں۔ ان کے متعلق یہی عرض ہے اور یہی کہا جا سکتا ہے۔

خرد کی تنگ دامانی[۱] سے فریاد　　نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

دنیا کے کسی بڑے مفکر کی فکر کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اس کے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ "عمرِ فکری" بالکل "عمرِ جسمانی" کے مماثل ہے۔ جسمانی عمر میں اگر لڑکپن، جوانی اور بڑھاپا پایا جاتا ہے تو عمرِ فکری میں بھی طفلی، شباب اور پختگی کے ادوار نمایاں نظر آتے ہیں ——— مغرب کے شاعرِ فطرت ورڈزورتھ کو لیجیے۔ اس نے خود اپنی نظم Lines above the Tintern Abbey میں اپنی عمرِ فکری کی تشریح کی ہے .... ہر بڑا شاعر ابتداء ہی سے خاص صلاحیتوں کا حامل ہوتا ہے۔ لڑکپن میں بھی ورڈزورتھ فطرت کے حسین اور دلکش نظاروں سے محظوظ ہوتا تھا۔ لیکن یہ حظ غیر شعوری تھا۔ اسے پتہ نہ تھا کہ آخر خوشی کے یہ ولولے دل میں کیوں پیدا ہوتے ہیں۔ پھر دورِ شباب آیا تو شاعر میں ایک طرح کا شعور پیدا ہوا۔ اب وہ شاہدِ فطرت کی اداؤں کو سمجھنے لگا۔ لیکن قوتِ اظہار اب بھی مفقود رہی۔ خود ہی سمجھتا اور خود ہی لطف اندوز ہوتا۔ لیکن دوسروں کو شریکِ مسرت نہ کر سکتا تھا۔ اس کے بعد پختگی کا دور آیا جس میں نہ صرف وہ فطرت کی گوناگونیوں کو سمجھنے اور انبساط حاصل کرنے لگا بلکہ فطرت کے رازہائے سربستہ کو واشگاف کرنے لگا اور دوسرے بھی اس سے

۱؎ یہ تاویل اشتراکیت کے پیرو مخدوم محی الدین صاحب ایم اے نے دفتر (سے) اسی جلسہ میں فرمائی تھی۔ دراصل اپنی دو تحریکات کا نتیجہ حسب یا مضمون ہے۔

[illegible]

علامہ اقبال پر بھی اسی قسم کے ادوار گزرے ہیں۔ ہم ان کے کلام کو اولاً دو شقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) بلحاظِ فکر (۲) بلحاظِ اثراتِ ماحول ——— شق اوّل کو پھر تین ذیلی شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

(i) دورِ استفہام (ii) دورِ تجسّس (iii) دورِ پختگی ....

اسی طرح دوسری شق کے بھی تین ذیلی حصّے ہو جاتے ہیں۔

(i) سفرِ یورپ سے قبل کا ہندوستانی زمانہ (ii) مغربی سیاحت کا دور (iii) سفرِ مغرب کے بعد کا حصّۂ عمر جو ہندوستان میں گزرا۔[1]

دورِ استفہام — اگر ہم تنقیدی نگاہ سے مطالعہ کریں تو پہلے ایک ایسا دور تھا ہے جس میں شاعرِ مشرق، شاعرِ مغرب کی طرح فطرت کے حقائق کے سمجھنے سے عاری ہیں۔ ابھی نہ تو شرحِ صدر ہوا ہے اور نہ ان کی نظر منظرِ اشیاء ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر چیز دکھائی دیتی ہے سمجھائی نہیں دیتی۔ گلِ رنگین سے حسن و جمال کا نظارہ کرتے ہیں باوجود گل کی بے ثباتی کے گل کو خاموش پاتے ہیں۔

لہ

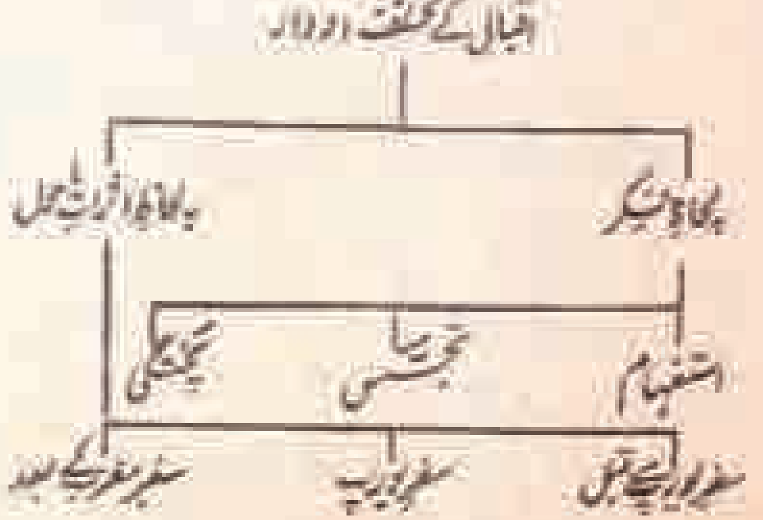

بلبل کی حالت زار سے دل بھر آتا ہے۔ تری کملائے گل سے پوچھتے ہیں۔

تو شناسائے خراش عقدۂ مشکل نہیں
اے گل رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں

دنیا کے مصائب پر نظر ڈالتے ہیں تو "قید حیات" اور "بند غم" دونوں لازم و ملزوم بلکہ ایک ہی دکھائی دیتے ہیں لیکن جب عاقبت کا خیال آتا ہے تو عالم عقبیٰ کی حقیقت سمجھ میں نہیں آتی۔ آخر وہ خفتگان خاک سے استفسار کرتے ہیں۔

آدمی واں بھی حصار غم میں ہے محصور کیا؟
اس ولایت میں بھی ہے انساں کا دل مجبور کیا؟

اس جہاں میں اک معیشت اور سو افتاد ہے
روح کیا اس دیس میں اس فکر سے آزاد ہے
کیا وہاں بجلی بھی ہے، دہقاں بھی ہے، خرمن بھی ہے
قافلے والے بھی ہیں، اندیشہ رہزن بھی ہے؟

"شمع و پروانہ" پر نظر پڑتی ہے لیکن پتہ نہیں چلتا کہ آخر شمع میں وہ کونسی جاذبیت اور حسن ہے کہ پروانہ اس پر نثار ہو جاتا ہے۔ شمع سے دریافت کرتے ہیں۔

"پروانہ تجھ سے کرتا ہے اے شمع پیار کیوں؟
یہ جان بے قرار ہے تجھ پر نثار کیوں؟"

"آزار موت میں اسے آرام جاں ہے کیا؟ شعلے میں تیرے زندگی جاوداں ہے کیا؟"

آفاق کی حقیقت کو سمجھ کر خیال پیدا ہوتا ہے کہ انفس میں غور کریں۔ کائنات صغیر[؟] کی حقیقت کو عریاں دیکھنا چاہتے ہیں تو خود پر نظر ڈالتے ہیں۔ لیکن سمجھ یہاں بھی کام نہیں کرتی۔

تجسس ہوں کہ عشق سراپا گداز ہوں
کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں

کائنات صغیر کی اجمالی حقیقت کی فہم سے عاجز آکر جزوی مطالعہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ "دل" کو لے کر اس پر غور کرنے لگتے ہیں۔ یہ دوانہ فکر کے بال و پر یہاں بھی جل جاتے ہیں۔ آخر تنگ آکر خرشیدۂ عقل سے پوچھنے لگتے ہیں:

"یارب اس ساغرِ لبریز کی مے کیا ہوگی؟
جادۂ مُلکِ بقا ہے خطِ پیمانۂ دل"

غرض اس دور کا کلام ہویدا کا ہویدا استفہام سے بھرا پڑا ہے[۱]۔

دورِ تجسّس اس دور سے گزر کر علامۂ موصوف ترقی کا ایک اور زینہ چڑھتے ہیں جسے میں منزلِ تجسّس سے تعبیر کرتا ہوں۔ یہاں استفہام کے بجائے تلاشِ حقیقت کی کوشش نمایاں نظر آتی ہے۔ اقبال سراپا تجسّس بن جاتے ہیں۔ سمندِ استقلال پر سوار دشتِ تجسّس میں سرگرداں نظر آتے ہیں کبھی محمل کو پالیتے ہیں اور کبھی محض غبارِ راہ میں پریشان و متحیر رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ "انسان" والی نظم میں قدرت سے گلہ کرتے ہیں

حجاب ہے ذوقِ آگہی کا — کھلتا نہیں بھید زندگی کا
حیرت آغاز و انتہا ہے — آئینے کے گھر میں اور کیا ہے

۱۔ ملاحظہ ہو اقبال حصہ بانگِ درا۔

لیکن باوجود اس "تحیّر" کے تجسس کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اور برابر فکر و تجسس میں مستغرق رہے۔ اور یہی دھن بھی حقیقت کو پا لیا۔

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے
خوبیِ قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے
عشق کی گرمی سے شعلے بن گئے چھالے مرے
کھیلتے ہیں بجلیوں کے ساتھ اب نالے مرے

اب وہ جان چکے ہیں کہ انسان[1] عبث پیدا نہیں کیا گیا بلکہ اس کی آفرینش کا کچھ نہ کچھ مدعا ضرور ہے ——— آفرینش انسانی کو فضول عبث نہ سمجھتے ہوئے حقیقت خلقت کی جستجو اس شعر سے بخوبی واضح ہے۔

اگر کوئی شے نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں
نگہ کو نظارے کی تمنا ہے دل کو سودا ہے جستجو کا

اسی مسلسل اور متواتر تجسس کا نتیجہ ہے کہ اقبال حسین فطرت کا نظارہ کر رہے ہیں اور اس طرح اس میں محو ہو کر حقیقت کو بے نقاب دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں
نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں

دورِ پختگی

یہ دونوں ادوار کل عمرِ شعری کی مناسبت سے بہت مختصر ہے۔ تجسس کے فوراً بعد "پختگی" کا زمانہ آیا۔ کلام اقبال کا بیشتر حصہ اسی دور سے متعلق ہے۔ "شاعرِ مغرب" کی طرح اب اقبال کی

---

[1] جیسا کہ خود قرآن مجید میں فرمایا ہے "اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا"۔

نظرِ ہوشیار بھی حقائقِ فطرت کو ان کی پوری جلوہ تابیوں کے ساتھ دیکھ رہی ہے۔ ایقانِ کامل پیدا ہو چکا ہے۔ شک و شبہ کو کوئی دخل نہیں۔ اسی وجہ سے مرتبۂ ناظروں کو نورِ یقین کے ساتھ وہ انکشافات دیکھ رہے ہیں اور دکھا رہے ہیں

کھلے جاتے ہیں اسرارِ نہانی — گیا دورِ حدیثِ لن ترانی[1]

اب حقیقتِ زندگی کوئی معمہ نہیں ہے اس لیے علی الاعلان کہہ رہے ہیں

چوں خبر دارم ز سازِ زندگی — با تو گویم چیست رازِ زندگی
غوطہ در خود صورتِ گوہر زدن — پس بخلوت گاہِ خود سر بر زدن
زیرِ خاکستر شرر اندوختن — شعلہ گردیدن نظرہا سوختن[2]

مقصدِ وجود جسے سمجھا نہ دیتا تھا اب نہ صرف معلوم کر چکے ہیں بلکہ دوسروں کو بتلا رہے ہیں۔

"وجود کیا ہے فقط جوہرِ خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا"[3]

حقیقتِ عشق جو دورِ اول میں حدِ فہم سے باہر تھی اب کمال طور پر فہمیدہ ہے چنانچہ عشق اور زندگی کا باہمی تعلق اس طرح واضح فرماتے ہیں۔

"عشق در جاں چوں بچشم اندر نظر
ہم درونِ خانہ ہم بیرونِ در"[4]

---

[1] بالِ جبریل صفحہ (۳۲)
[2] ماخذ جو اسرارِ خودی اندر بیان تحقیق اینکہ حیاتِ خودی از تخلیق و تولیدِ مقاصد است (صفحہ ۱۸)
[3] "ضربِ کلیم" ص ۹۳ "زندگی"
[4] "اسرارِ خودی" ص ۱۶ "دعا"

حیات کے لئے تو عشق کو ضروری قرار دیا لیکن خود عشق کی پختگی کے لئے دو شرائط عائد کیں ـــــــ اوّلاً

"عشق را از تیغ "لا" آگاہ کن
آشنائے رمز "الا اللہ" کن"[1]

پھر فرمایا:

شرع محبت میں ہے عشرت منزل حرام
شورش طوفاں حلال لذت ساحل حرام[2]

حیات انسانی کی حقیقت، اس کی غرض اور اس کے ارتقاء کو حسن خوبی سے واضح فرمایا۔

دلا رمز حیات از غنچہ دریاب	حقیقت در مجازش بے حجاب است
ز خاک تیرہ مے روید ولیکن	نگاہش بر شعاع آفتاب است

اسی طرح "حیات دوام" کا صحیح مفہوم بھی بتلایا۔

تو شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیات دوام؟ سوختن ناتمام[3]

غرض اس دور میں تمام اسرار آشکار ہیں۔ اب نہ فہم اقبال کہیں عاجز نظر آئے گی اور نہ مجبور کیونکہ اب وہ "ہوشیار" ہو چکی ہے ـــــــ تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل۔

آئیے کچھ عشق دوم کے اثرات اصول کا بھی جائزہ لیں ـــــــ

۱؎ ضرب کلیم، "علم و عشق"
۲؎ پیام مشرق صفحہ ۱۱۰

ابتدائی ہندوستانی دور

مغربی سیاحت سے پہلے کا دور اقبال کی فکر و شاعری کا ابتدائی زمانہ ہے۔ اس میں ان کی نظر محدود ہے۔ اسلامی حقائق قلب میں پوری جلوہ افروزیوں کے ساتھ موجود نہیں۔ اسی لئے کبھی "نیا شوالہ"[1] تعمیر کرتے "قومیت متحدہ" کے گن گانے لگتے ہیں تو کبھی

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا"[2]

کا نعرہ بلند کر کے جذبۂ وطنیت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ع

"خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے"

کی صدا بلند کر کے کٹر وطن پرستوں کے زمرہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اسی دور کے بعض اشعار کو لے کر آج کل کے خیرہ نظر افراد اقبال کو "قوم پرست" اور "وطن پرست" ثابت کرنے کی سعی عبث کرتے ہیں اور آئندہ ان بتوں پر جو ضرب لگائی گئی اس پر نظر دوڑانا گوارا نہیں کرتے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ حقیقت کے متلاشی نہیں بلکہ پرستارِ نفس بنے ہوئے ہیں۔

مغربی سیاحت

غرض اس کے بعد جب حضرت اقبال کو مغربی سیاحت کا موقع ملا تو وسعتِ مشاہدہ سے وسعتِ نظر بھی پیدا ہو گئی۔ اسلامی تہذیب و تمدن کا مغربی کلچر سے مقابلہ کیا۔ ہر شے کو بنظر غائر دیکھا اور ہر چیز کا گہرا مطالعہ کیا ——— وہاں کی ہر "تعمیر" میں بجز "تخریب" کے

---

[1] بانگ درا "نیا شوالہ"

[2] بانگ درا "ترانۂ ہندی"

کچھ نہ دکھائی دیا حقیقت شناس مردِ خدا کہہ اٹھا

"دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے

کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا"[1]

مغربی تمدن کو جب اس جوہری نے اسلام کی کسوٹی پر پرکھا تو اس کی ظاہری نظر فریبی حقیقت کو زیادہ پوشیدہ نہ رکھ سکی اور جوہری پکار اٹھا

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب

کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف[2]

فرنگی مدنیت جو سطحی نظروں کے لیے سرسبزی کا تماشہ دکھائی دیتی ہے نظرِ ہوشیار کے آگے اس کی شکست اس طرح عیاں ہے۔

بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس

کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

بہرکیف مغربی ماحول کے اثرات جو موصوف کے قلب و دماغ پر مترتب ہوئے ان کا اجمالی خاکہ ان اشعار سے بخوبی ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

"جلوۂ او بے کلیم و شعلۂ او بے خلیل

عقلِ ناپروا متاعِ عشق را غارت گر است

درد و دانش گرمی یک آہ بے تابانہ نیست

رندِ ایں میخانہ را یک لغزشِ مستانہ نیست[3]

۱؎ ضربِ کلیم۔ "مغربی تہذیب"

۲؎ بالِ جبریل صفحہ (۱۰۹)

آخری زمانہ

اس سفر سے جب علامہ موصوف واپس ہوئے تو چونکہ شرقیت اور مغربیت کے حقائق یکساں طور پر واضح ہو چکے تھے بمقابلہ مغرب کے مقابل اسلام کی حقیقت اور کاملیت بھی ظاہر ہو چکی تھی اس لئے اب ان کا ایمان اور ایقان پختہ تر ہو چکا تھا۔ قرآنی حقائق ان کے قلب میں ایقان کے اس درجہ تک پہنچ چکے تھے ——— وہ ایک حقیقت کے متلاشی تھے ان کی طبیعت میں تڑپ تھی" یہی وجہ ہے کہ کلام اللہ سے انہوں نے صحیح رہبری حاصل کی حقائق و معارف کھلتے گئے اور گتھیاں سلجھتے گئے جب خود بھیجنے والے نے یہی کتاب بھیجتے ہوئے بتلایا تھا ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ غرض جوں جوں اسرار کھلتے گئے علامہ نے ان کو بلا کم و کاست ہمارے سامنے رکھ دیا۔ جو غلط تخیلات دو بادلوں میں پیش کر چکے تھے ان کی بلا تذبذب تردید کر دی کیونکہ اس وقت اُن کے خیالات اور نتائج فکر اول نہ تھے اور اب ان کا فلسفہ مستحکم بنیادوں پر قائم ہو چکا تھا ——— پھر ان کی وقعت کو گرا نہیں سکا "جویائے حقیقت" ہونے پر دلالت کرتی ہے اور حقیقتاً یہی وہ مقام ہے جو اقبال کو عام مفکرین سے ممتاز کر دیتا ہے حقانیت کے تقاضے سے انہوں نے غلط تخیلات کے بت خانہ پر جو ضرب بھی لگائی اس سے وہ مردان حق کی صف میں شامل ہو گئے۔ اگر وہ اس بت خانہ پر ضرب نہ لگاتے تو راستہ نہ چھوٹتا اور نہ وہ جلوۂ حقیقت سے دوچار ہوتے جو صرف "مومنین" کا مقام ہے۔ اس دور کی ہر بات سے نہ صرف صداقت اور پختگی جھلکتی ہے بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمات محمدی ان کے قلب و

۱؎ پارۂ الٓمٓ

دماغ کے آئینوں سے منعکس ہو کر ہم تک پہنچ رہی ہیں۔

اگر اقبال نے پہلے وطنیت کے راگ الاپے تھے تو سننے والے سُن کر اس پر جھومے اب کچھ دوسری ہی نے نکل رہی ہے جو حقیقتاً پہلے سے کہیں زیادہ دلکش اور دلنشیں ہے۔ دیکھیں کہ اس اژدہائے وطنیت کو عصائے صداقت نے ہضم کر لیا ہے۔ پھر اب اس کا ذکر کیا! علامہ نے کیا خوب اور بجا فرمایا

"ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے"[1]

اگر اقبال نے ابتداءً "ترانۂ ہندی" لکھا تھا تو کیا تعجب اب "ترانۂ ملی" کو نہیں دیکھ سکتے جو انہیں کی فکر کی پیداوار ہے؟

دیکھو اب حقیقت ہی نے قومیت کے زہریلے اثرات کو جان کر اس کی تردید کر دی ہے۔ اب وہ "قومی" نہیں بلکہ "بین الاقوامی" بن چکا ہے جب ہی تو کہہ رہا ہے۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا[2]

اب علامہ زمان و مکان کے قیود سے بالا۔ جو سمجھتے ہیں اللہ پر مسلم ایسا ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔

"مسلمانیم آزاد از مکانیم　　برون از حلقۂ نہ آسمانیم"[3]

---

[1] بانگِ درا: "وطنیت"
[2] بانگِ درا: "ترانۂ ملی"
[3] ارمغانِ حجاز: "حضورِ حق"

کسی خاص خطۂ زمین سے غیر وابستگی اور صرف اس ایک سے لگاوٹ جس سے بغیر رشتہ جوڑے نہ اخوت ممکن ہے نہ ترقی، مسلم کا شعار ہے۔ اسی چیز کو علامہ موصوف نے پیام مشرق میں یوں پیش کیا ہے۔

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم ۱

غرض اسی دور کی بات اسی اقبال کا منشا و مقصد یا پیام تصور کیا گیا ہے حالانکہ یہی دورِ فکر کی پختگی اور کاملیت کا ہے۔ اس دور میں جس چیز کی دعوت دی گئی وہی ان کا منشائے اصلی قرار دیا جا سکتا ہے، بقیہ چشم ان کی ابتدائی تاریکی میں تو کچھ دیکھ لیتے ہیں لیکن اس دور کی تابانیوں سے چوندھیا جاتے ہیں اور کچھ کہا ہی نہیں رہتا ـــــ اگر یہ حقیقت ہے تو چشمۂ آفتاب کا کیا گناہ، وہ خیرگی قابلِ ملامت ہے ...... اقبال کے منشائے اصلی کو سمجھنے کیلئے ان کی یہ نصیحت بہت کافی ہے

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبیست

اس تحلیلی مطالعہ کی غایت یہ ہے کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ ان خیالات کے کرنے کی خود حضرت اقبال نے بعد میں تردید فرما دی، یہ سمجھنا کہ انہوں نے وطنیت یا قومیت کا درس دیا سراسر غلطی ہے۔ کیا اقبال حامل وحی تھے کہ ان کی حرکتِ زبان سے نکلا ہوا ہر کلمہ اور جنبشِ قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ صحیح ہوتا، وہ

۱۔ پیام مشرق۔

پیغمبر نہیں بلکہ ایک "مردِ مومن" سمجھتے، حقیقت بیں اور حقیقت شناس انسان تھے جب انھوں نے خودکشی خیال کی تردید کر دی تو پھر اسی کو ان کا منشا یا پیام قرار دینا ان پر ظلم نہیں بلکہ کہنے والے کی نفس پرستی پر دلالت کرتا ہے۔ اقبال یقیناً انقلاب کے خواہاں تھے لیکن کیسا انقلاب؟ وہ جو روس میں برپا کیا گیا؟ جس میں بربریت تھی اور جو ہر حال انسانیت کو برباد کرنے کا جذبہ[1] موجود تھا ——— نہیں ہرگز نہیں وہ پہلے "نفس" میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے اور پھر آفاق میں۔ ایک ایسا انقلاب جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے رحمت اللعالمین نے پیدا کیا تھا۔ جس میں مردم کشی نہ تھی۔ بلکہ باطل کشی تھی اور جس کی اس وجہ سے کل انسانیت کے فلاح دارین تھی ——— انسانی غارت گری کے انقلاب دنیا جب دیکھ چکی ہے اقبال کی روح اب ایسے انقلاب کے لئے تڑپ رہی ہے جو باطل کو جلا کر خاکستر کر دے........ جو انسانیت کے لئے باعث رحمت ہو۔

---

[1] اشتراکیت میں اگر مزدور ہی کو اپنایا جاتا ہے تو دوسری طرف سرمایہ دار طبقہ کو موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے۔ اس طرح بربریت یہاں بھی پائی جاتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ سرمایہ کی مساوی تقسیم اس طرح ہو کہ نہ سرمایہ دار مزدور کو اپنے شکنجہ میں جکڑ سکے اور نہ مزدور آتش انتقام میں سرمایہ دار کا گلا گھونٹے ——— آج عالم بیتاب ہے کہ ایسا انقلاب آئے جس میں باطل مٹ جائے لیکن انسانیت نہ مٹے جو صرف اسلام ہی نے پیدا کیا جس میں ایسے وہ اصول دیئے گئے جو برتری یا کمتری کے جذبات کے منافی تھے اور جن میں توازن قائم ہونے سے خود بخود مساوات ہو گی۔

میر ولی الدین
ایم اے، پی ایچ ڈی
(لندن)

اقبال اور حدیثِ جبر و قدر

مرید: اے شریکِ مستیٔ خاصانِ بدر — میں نہیں سمجھا حدیثِ جبر و قدر
پیر: بال بازاں را سوئے سلطاں برد — بال زاغاں را بہ گورستاں برد"

(بالِ جبریل)

"میں نہیں سمجھا حدیثِ جبر و قدر"۔ آغازِ فکرِ انسانی سے یہی آواز بار بار اٹھتی فضا میں بلند ہوتی رہی لیکن انسان نے اس مسئلہ کو محض نظری کہہ کر اس پر غور و فکر کرنا کبھی ترک نہیں کیا۔ کیوں؟ آخر اس مسئلہ میں کیا جاذبیت ہے؟ ہم اس کے ذکر کے ساتھ فوری عملی سے عاری محض ایک کے کان کیوں کھڑے ہو جاتے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ محض نظری نہیں۔ ہمارا اخلاق، نظام و دینیات، سیاسیات، تعلیمات، معاشیات اور عمرانیات اسی مسئلہ کے فہم و افہام پر مبنی نظر آتا ہے۔

اگر ہم مجبور ہیں تو دینیات ہمیں سمجھائے کہ روزِ قیامت ہمارا محاسبہ کیوں ہوگا، جبر ہمیں بتلائے کہ مجرم کو سزا دینے کے کیا معنی اور تعلیمات تزکیہ، احتساب ...

تصفیۂ قلب پر اتنی مصر کیوں ہے؟ اگر ہم آزاد ہیں تو پھر بقول اسپینوزا کیوں ہمیں اپنی زبان تک پر بھی اختیار نظر نہیں آتا؟ جذبات کا غدر و شور شر دامنگیر کیوں ہے اور عقل شہوات کی غلام کیوں رہتی ہے؟ آتش انتقام سے مشتعل ہو کر بچہ بھی تو یہی سمجھتا ہے کہ وہ اپنے دشمن پر آزادانہ حملہ کر رہا ہے۔ مدہوش شرابی کو یقین ہوتا ہے کہ جو کچھ اسکی زبان سے نکل رہا ہے اس میں اس کے اختیار اور مرضی کو پورا دخل ہے گو بعد میں پچھتاتا ہے کہ یہ کیوں اس کی زبان سے نکلی ہوتی!" انسان اپنے کو آزاد و مختار اس لئے سمجھتا ہے کہ اس کو اپنے افعال کا تو شعور ہوتا ہے لیکن وہ ان اسباب و علل سے جاہل ہے جو ان افعال کا تعین کرتی ہیں۔"

(اسپینوزا)

ہماری رائے میں اس قدیم مسئلہ کے حل میں عقل نظری ناکامیاب رہی ہے یہ مسئلہ اب بھی لاینحل ہے۔ یہ گتھی نہیں سلجھتی ہے! عقل کی اس عاجزی کو دیکھ کر پیغمبر اسلام (فداہ ابی و امی) نے فرمایا کہ "اذا ذکر القدر فامسکوا"[1] (جب تقدیر کا ذکر کیا جائے تو تم خاموش ہو جاؤ) یہ حکم ہوا عوام کو، عالم اور خبیر سے فرمایا گیا "لا تکلموا فی القدر فانه سر الله فلا تفشوا الله سره" (تقدیر میں گفتگو نہ کیا کرو کیونکہ وہ خدا کا ایک راز ہے پس اللہ کے راز کا افشا نہ کرو) اس دوسرے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے ان لوگوں پر اس اہم مسئلہ کو فاش کر دیا ہے جو اس کے سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں جن کی شان میں فرمایا گیا ہے "لمن کان له قلب او القی السمع وهو شهید"[3] اسلام کے …

---

[1] طبرانی عن ابن مسعود کذا فی الجامع الصغیر للسیوطی [2] ابو نعیم فی الحلیہ کذا فی کنز

[3] جس کے پاس دل ہے اور کان لگایا اس حال میں کہ وہ خود حاضر ہے۔

صوفی فلسفی شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی بھی یہی رائے ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

"فسرّ القلب من اجل العلوم یفهمه الله تعالیٰ الا من اختصه الله بالمعرفة التامة" سرِ قلب بزرگ ترین علوم سے ہے اور اس سے حق تعالیٰ سوائے اس کے کسی کو آگاہ نہیں کرتے جس کو انہوں نے معرفتِ تامہ کے ساتھ مختص کر لیا ہے۔"[1]

ہم اقبال سے "سرِ قلب" دریافت کر رہے ہیں۔ اگر اقبال محض شاعر ہوتے تو ہم بھلا اس فلسفیانہ نکتے کو ان سے سمجھنے کیوں جاتے؟ گو اس میں شک نہیں کہ بفحوائے "ان من الشعر لحکمۃ"[2] علوم و حقائق شعراء کے ہاں بھی مل سکتے ہیں۔ لیکن مسئلہ کی نوعیت ہمیں ایک شاعر کے ہاں جانے سے روکتی ہے۔ اگر اقبال محض فلسفی ہوتے تو بھی ہم اس مسئلہ پر ان سے بحث کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے کیونکہ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ یہاں فلسفہ کی منطقی کج بحثی نظر نہیں آتی۔ اقبال علاوہ سحر بیان شاعر اور جید فلسفی ہونے کے ہمیں عارف بھی نظر آتے ہیں۔ جن پر صحبتِ پیرِ روم نے بہت سے معارف کا دروازہ کھول دیا تھا۔ مثلاً

صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

(بالِ جبریل)

۱۔ فصوص الحکم اشاعت مبارک علی ایڈیشن صفحہ ۳۲ فص عزیز یہ

۲۔ بعض اشعار حکمت ہیں۔ (حدیث بخاری)

فلسفہ کی لمبی داستان سے اکتا کر انھوں نے اپنے مولا سے عرض کیا تھا:-

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں ۔۔۔ مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

(بال جبریل)

وہ جان گئے تھے کہ:-

عقل گو آستاں سے دور نہیں ۔۔۔ اس کی تقدیر میں حضور نہیں

دل بینا بھی کر خدا سے طلب ۔۔۔ آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

علم میں بھی سرور ہے لیکن ۔۔۔ یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

(بال جبریل)

جب انھیں حضور کی لذت حاصل ہونے لگی تو وہ اب عقل نظری کے اقتدار سے متنفر نظر آتے ہیں اور "دانش برہانی" میں "حیرت کی فراوانی" کے سوا انھیں کچھ نہیں نظر آتا

مجھے وہ درس فرنگ آج یاد آتے ہیں

کہاں حضور کی لذت کہاں حجاب دلیل

(بال جبریل)

عارف کا مرتبہ و مقام اقبال اچھی طرح جانتے ہیں ۔

علم کی حد سے پرے بندۂ مومن کے لئے

لذت شوق بھی ہے نعمت دیدار بھی ہے

(بال جبریل)

اقبال کی اس حیثیت سے واقف ہو کر ہم دریافت کرتے ہیں کہ مسئلہ جبر و قدر کے متعلق ان کے "پیر" نے انھیں کیا سکھایا ہے؟ جواب میں اقبال کا پوزیشن اس شعر سے صاف ظاہر ہو رہا ہے ۔

"چنیں فرمودہ سلطانِ بدر است
کہ ایمان درمیانِ جبر و قدر است"

(زبورِ عجم)

ظاہر ہے کہ اقبال مسئلہ کا صحیح حل وہی سمجھ رہے ہیں جو ان کے آقائے نامدار نے بیان کیا ہے کہ انسان مجبور بھی ہے اور مختار بھی اور مسئلہ صحیح کی یافت اگر ہو سکتی ہے تو اسی طرح کہ راستہ جبر و قدر کے درمیان اختیار کیا جائے۔

پہلے جبر کے پہلو پر نظر کیجیے جس کسی کا خدا پر یقین ہے وہ خدا کو خالقِ افعال مانے بغیر نہیں رہ سکتا جس طرح خدا ہمارے جسموں اور ذروں کا خالق ہے وہ ہمارے افعال کا بھی خالق ہے۔ یہ عقیدہ قرآن میں بصراحت النص پایا جاتا ہے توجیہہ تاویل کا امکان تک نہیں۔ ان شواہد پر غور کیجیے۔

اِنّا کُلَّ شَیءٍ خَلَقنٰہُ بِقَدَرٍ
وکل شیء فعلوہ فی الزبر

سورہ ۵۴ آیت ۴۹ ۵۲

ہم نے ہر چیز بنائی ہے پہلے ٹھہرا کر
اور جو چیز انہوں کی لکھی ہے ورقوں میں"

"شیء" میں افعال بھی داخل ہیں اور چونکہ حق تعالیٰ "خالق کل شیء" ہیں لہٰذا یہ ضروری طور پر لازم آتا ہے کہ وہ "افعال" کے بھی خالق ہیں اگر فعل مخلوق نہ ہوتے (باوجود اس امر کے کہ ان پر "شیء" کا اطلاق ہوتا ہے) تو پھر حق تعالیٰ بعض اشیاء کے خالق ہوتے اور بعض کے نہ ہوتے اور ان کا یہ قول کہ وہ "ہر شے کے خالق ہیں" کذبِ محض ہوتا تعالی اللہ عن ذلک علواً کبیرا۔ اس بحث قیاسی کی بھی ہمیں کوئی ضرورت نظر نہیں آتی قرآن میں یہ صاف

طور پر کہا گیا ہے کہ

واللہ خلقکم وما تعملون

اور اللہ نے پیدا کیا تمہیں اور جو تم کرتے ہو

(سورۂ والصّٰفّٰت آیت ۹۶)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ ہمارے افعال کے خالق ہیں۔ یہ تھا ایجابی طرزِ بیان، ذرا سلبی طریقِ گفتگو پر بھی غور کیجیے

یہاں حق تعالیٰ اس امر سے انکار کر رہے ہیں کہ ان کے سوا کوئی خالق اور بھی ہے:۔

"ام جعلوا للہ شرکاء خلقوا کخلقہ فتشابہ الخلق علیھم قل اللہ خالق کل شیء وھو الواحد القھار"

کیا ٹھہرائے ہیں انھوں نے اللہ کے لئے شریک کہ انھوں نے کچھ پیدا کیا جیسے پیدا کیا اللہ نے پھر مشتبہ ہو گئی پیدائش ان کی نظر میں کہہ اللہ ہے پیدا کرنے والا ہر چیز کا اور وہی ہے اکیلا زبردست۔"

(سورۂ الرعد آیت ۱۶)

اب فرض کیجیے کہ خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے اور انسان اپنے افعال پیدا کرتا ہے۔ یہ تو یقینی بات ہے کہ افعال افرادِ انسانیہ سے بہت زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ ہر شخص ان گنت افعال کو پیدا کرتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ لازمی طور پر نکلتا ہے کہ انسان کی پیدا کردہ چیزیں، جو خود خدا کی مخلوق ہے، اس خدا کی پیدا کردہ چیزوں سے زیادہ ہوں گی جو انسان کا خالق ہے اس کے معنے یہ ہوئے کہ انسان قدرتِ تخلیق میں خدا سے بھی زیادہ کامل ہے اور اس کی مخلوق خدا کی مخلوق سے شمار میں کہیں زیادہ ہے! یہ عقیدہ تو صریحاً احمقانہ ہے مخلوق

خالق سے زیادہ قوی کیسے ہو سکتا ہے۔ لہٰذا نتیجے کے طور پر یہی ماننا پڑے گا کہ حق تعالیٰ نہ صرف انسان کے خالق ہیں بلکہ اس کے افعال کے بھی۔ " واللّٰہ خلقکم وما تعملون " صرف حق تعالیٰ ہی خالق ہیں، فاعل ہیں، متصرف ہیں، لافاعل فی الوجود الا اللّٰہ ساری کائنات ان کی مخلوق، انسان اور اس کے افعال سب کائنات میں شامل ہیں۔ لہٰذا یہ سب ان کے مخلوق ہیں۔

جاوید نامہ میں اقبال اسی توحید فی الاشیاء و توحید فی الافعال کو بیان کر رہے ہیں:۔

می شناسی طبع دراک از کجاست؟
جو ہرے اندر تگ خاک از کجاست؟
طاقت فکر حکیماں از کجاست؟
قوت ذکر کلیماں از کجاست؟
ایں دل و ایں واردات از کیست؟
ایں فنون و معجزات از کیست؟
گرمی گفتار داری؟ از تو نیست؟
شعلۂ کردار داری؟ از تو نیست؟
ایں ہمہ فیض از بہار فطرت است
فطرت از پروردگار فطرت است

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا اس کی تائید کلام نبوی سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ ارأیت

لے صحاح ۱۳

ما نعمل فیہ علی امر قد فرغ منہ ام علی امر نستانفہ؟ فقال علی امر قد فرغ منہ، فقال عمر افلا نتکل وندع العمل، فقال اعملوا فکل میسر لما خلق لہ" یعنی جس کام میں ہم لگے ہوئے ہیں اس کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں؟ کیا یہ کام پہلے ہی ختم ہو چکا ہے یا ہمیں نے اس کو شروع کیا ہے؟ فرمایا پہلے ہی سے ختم ہو چکا ہے۔ عمرؓ نے کہا تو کیا پھر ہمیں توکل نہیں کرنا چاہیے اور ترک عمل نہ کرنا چاہیے" یعنی جب پہلے ہی سے ساری چیزیں مقرر و معین ہو چکی ہیں تو پھر ہماری کوشش و عمل سے کیا فائدہ؟ رسول اللہ نے فرمایا کام کیے جاؤ ہر شخص کے لئے وہ کام آسان کر دیا گیا ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔" عمرؓ نے کہا الآن لجد العمل" اور اپنے کام پر لگ گئے۔ تقدیر کے بہانہ سے عمل ترک نہیں کیا جا سکتا۔ دوائی فرائض میں اب ایک لذت پیدا ہو جاتی ہے۔ کوشش کو تشویش و فکر سے نجات مل جاتی ہے۔ ہم جان لیتے ہیں کہ ہر شخص کے لئے وہ کام آسان کر دیا گیا جس کے لئے وہ پیدا ہوا ہے۔"

ایک اور دفعہ رسول اللہ سے پوچھا گیا ارأیت رقی نسترقیہا ودواء نتداوی بہ ھل یرد من قدر اللہ تعالیٰ؟ فقال انہ من قدر اللہ یعنی" جو منتر کہ ہم کرتے ہیں اور جو دوائیں کہ استعمال میں لاتے ہیں کیا یہ حق تعالیٰ کی تقدیر کو پھیر سکتی ہیں؟ فرمایا یہ بھی حق تعالیٰ ہی کی تقدیر سے ہوتا ہے۔" آپ کا یہ ارشاد اور زیادہ صاف اور واضح ہے کہ" لا یؤمن احدکم حتی یؤمن بالقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ"

لہ رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ کذا فی المشکوٰۃ ۱۲۔ کہ صحاح ۱۲

یعنی کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس امر پر ایمان نہ لائے کہ خیر و شر کی تخلیق من اللہ ہے۔

تعلیم اسلام میں جبر کا یہ پہلو صاف ہے اور اس سے صرف یہی چیز سمجھ میں آتی ہے کہ ہر شے کی تخلیق من اللہ ہے اور اقبال یہ کہہ کر "ایں ہمہ فیض از بہار فطرت است۔ فطرت از پروردگار فطرت است" "ہمہ از دست تست" کے نظریے کے قائل اور حامی نظر آتے ہیں۔ لیکن جبر کی یہ ساری تعلیم قدر یا اختیار یا "آزادیٔ ارادہ" کے منافی نہیں۔ بظاہر ہماری یہ بات عجیب و غریب نظر آتی ہے' دو متضاد چیزوں میں تطبیق واقعی عجیب بات ہے۔ لیکن قرآن کا یہی اعجاز ہے' اور اقبال اس تضاد کو بڑی شدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

جو کچھ میں نے کہا ہے اس کی تائید میں میرے پاس دلائل موجود ہیں پہلے مجھے آزادیٔ ارادہ اور ذمہ داری کے نظریے کی تشکیل کرنے دیجئے جو قرآن کریم میں پیش کیا گیا ہے' خلق من اللہ کے دعوے کے ساتھ ساتھ قرآن میں انسان کو اپنے افعال کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے' اس ظاہرا التضاد کی وجہ سے آپ کو جو بے چینی محسوس ہو رہی ہے اس پر ذرا سا صبر کیجئے ممکن ہے کہ اس مقالہ کے ختم پر آپ کو تسکین ہو جائے۔

انسان اپنے افعال کا ذمہ دار ہے۔ وہ اپنے افعال کا کاسب ہے۔ اسی لئے وہ جزا و سزا کا مستحق ہے۔ اسی کے لئے اوامر و نواہی کا نزول ہوا ہے اور اسی وجہ سے حق تعالیٰ نے اس کے ساتھ وعدے کئے ہیں اور وعید بھی کی ہے چنانچہ قرآن میں واضح طور پر بتلا دیا گیا ہے کہ

"لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا لہا ما کسبت وعلیہا ما اکتسبت" اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہے

جس نے جو کمایا اس کو وہی ملتا ہے اور اسی پر پڑتا ہے جو اس نے کیا

(البقرہ آیت ۲۸۶)

یہاں اعمال کی ذمہ داری کا کام انسان پر رکھا گیا ہے وہ اپنے خیر کا کو ہے اور شر کو بھگتتا ہے۔ ظاہر ہے کہ فعل اخلاقی کا صحیح معنی میں اس وقت تک ارتکاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ فاعل اپنے فعل کا ذمہ دار نہ ہو۔ اگر ایک شخص سو رہا ہے یا اس کو ڈر سے بیہوشی دی گئی ہے یا وہ پاگل ہے یا شیر خوار ہے تو وہ اخلاقیاتی معنی کے لحاظ سے فاعل قرار ہی نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ اس کا فعل اختیار اور عقلی ارادہ پر مبنی نہیں اور جب قرآن میں یہ کہا جاتا ہے کہ

"ان احسنتم احسنتم لانفسکم وان اساتم فلھا

(اگر تم نے بھلائی کی تو اپنے لئے کی اور برائی کی تو اس کا وبال بھی تم ہی پر ہے) - تو انسان کو اس کے اختیار اور عقلی ارادہ کی بنا پر ذمہ دار قرار دیا جا رہا ہے۔ اسی مفہوم کو امام حسنؓ ظاہر فرماتے ہیں "ان اللہ تعالیٰ لایطاع باکراہ ولا یعصی بغلبۃ ولم یھمل العباد من المملکۃ"

اللہ تعالیٰ کی اطاعت بجبر و اکراہ نہیں ہو رہی ہے اور نہ اس کی نافرمانی کسی قوت قاہرہ کی وجہ سے عمل میں آ رہی ہے اور اس نے اپنے بندوں کو اپنے ملک میں بیکار نہیں چھوڑ دیا ہے۔ "لا اکراہ فی الدین" قرآن کا دستور ہے۔ نفس کے ارتکاب میں جبر ہو تو وہ اخلاقی فعل کیسے کہلایا جا سکتا ہے؟ سہل بن عبداللہؒ کا ارشاد ہے کہ "ان اللہ لا یقوی الابرار بالجبر وانما قوتھم بالیقین" یعنی حق تعالیٰ نے نیکوں کو اطاعت کی قوت جبراً عطا نہیں کی ہے بلکہ انھیں یقین کے ذریعہ

قوت دی ہے اس خصوص میں اکابر صوفیہ میں سے کسی کا یہ قول پر منزلہ قانون قرار دیا جا سکتا ہے۔

"من لم یومن بالقدر فقد کفر ومن احال المعاصی علی اللہ فقد فجر۔"

"جو قدر پر ایمان نہ لائے وہ کافر ہے اور جو معاصی کو خدا کے حوالے کرتا ہے وہ فاجر ہے۔"

حق تعالیٰ کی نافرمانی کے لیے آزادی ارادہ کی ضرورت ہے۔ ان کی نافرمانی ممکن ہے اور جب بھی معصیت کا ارتکاب ہوتا ہے نافرمانی وقوع پذیر ہو رہی ہے۔ لہٰذا انسان کو انتخاب اور آزادی حاصل ہے جس کو وہ گناہوں کے ارتکاب کے وقت استعمال کرتا ہے۔

انسان کے اس اختیار کو، خودیت کو، جبر سے آزادی کو اقبال بڑے جوش سے پیش کرتے ہیں ؎

بپائے خود مزن زنجیر تقدیر
تہ این گنبد گردوں رہے ہست

اگر باور نداری خیز و دریاب
کہ چوں پا وا کنی جولانگہے ہست

(پیامِ مشرق)

جاوید نامہ میں ایک نئے انداز سے کہتے ہیں ؎

از خیاباں نقد خودی در باختند
نکتۂ تقدیر را نشناختند

رمز باریکش بحرفے مضمر است
تو اگر دیگر شوی او دیگر است
خاک شو نذر ہوا سازد ترا
سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا
شبنمی؟ افتندگی تقدیر تست
قلزمی؟ پایندگی تقدیر تست

اب ہمارے سامنے اثبات Thesis اور نفی Anti-Thesis دونوں صاف طور پر پیش کر دیئے گئے ہیں
انسان اپنے افعال میں مجبور ہے۔ حق تعالیٰ انسان کے خالق ہیں اور اس کے افعال کے بھی خالق ہیں۔ "خلقکم وما تعملون" "بیان" انسان اپنے اختیار و انتخاب میں آزاد ہے' اسی لیے اپنے افعال کا ذمہ دار ہے اور اسی لئے سزا و جزا کا مستحق ہے۔ "من عمل صالحا فلنفسہ" نیز "افرأیتم ما تحرثون" نقیض بیان:

اس تضاد کو رفع کرنے کے لئے ہم آپ کو کچھ دیر کے واسطے تجسس و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ تفکر بقول ہیگل کے کمزور دماغ کے لئے اسی قدر مشکل ہے جس قدر کمزور پشت کے واسطے بار گراں کا اٹھانا۔ دونوں مجبور ہیں اور اس لئے معذور۔ نہ ایک سے تفکر ہو سکتی ہے اور نہ دوسرے سے بوجھ اٹھ سکتا ہے۔ یہاں ہمارا خطاب اہل فکر سے ہے۔ ان چند قضایا پر غور کیجئے۔ ہمارا دینی یقین ہے کہ حق تعالیٰ موجود ہیں اور وہ عالم مطلق بھی ہیں۔ اب عالم کے لئے "علم" اور "معلوم" کی ضرورت ہے۔ حق تعالیٰ کے ان تین اعتبارات میں ابتدا ہی سے صاف طور پر تمیز کی جا سکتی ہے۔ وہ اپنے ہی افکار و تصورات

کے عالم ہیں' یعنی ان کے علم کے معلوم ہیں' معروض ہیں' علم بغیر معلومات کے ویسے ہی محال ہے جیسے قدرت بغیر مقدورات کے' سمع بے مسموعات اور بصر بے مبصرات کے۔ حق تعالیٰ چونکہ ازل سے عالم ہیں' اور علم بغیر معلومات کے ناممکن' لہٰذا ان کے معلومات بھی ازلی ہیں۔ یعنی معلومات "غیر مجعول" یا غیر مخلوق ہیں۔ علم حق تعالیٰ کی ایک صفت ہے' اس کا ان کی ذات سے انفکاک ناممکن ہے' ورنہ حق تعالیٰ کو جہل لازم آئے گا۔ تعالی اللہ عن ذالک' چونکہ حق تعالیٰ غیر مخلوق اور ازلی ہیں ان کا علم بھی غیر مخلوق ہے۔ اسی طرح چونکہ ان کا علم کامل ہے لہٰذا ان کے معلومات بھی کامل ہوں گے۔

اب حق تعالیٰ کے معلومات کو فلاسفہ "ماہیات اشیاء" کہتے ہیں اور صوفیہ "اعیان ثابتہ" یا "صور علمیہ" یا "معلومات حق" یا "حقائق ممکنات" یا "ازل عمل" ۔ یہ جیسا کہ کہا گیا' اولاً غیر مجعول ہیں اور ثانیاً کامل اور عدیم التغیر۔ ظاہر ہے کہ ہر "عین" کی اپنی خصوصیت ہوگی جس کو اس کی فطرت کہا جا سکتا ہے۔ اس کو دوسرے الفاظ میں "عین" کی "قابلیت" یا "اقتضا" یا قرآنی اصطلاح میں "شاکلہ" کہا جاتا ہے (قل کل یعمل علی شاکلتہ)

یہ بھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ اعیان چونکہ غیر مجعول و غیر متغیر ہیں لہٰذا ان کے اقتضاءات یا قابلیات و شاکلات بھی غیر مخلوق و عدیم التغیر ہیں۔

قابلیت پے جعل جاعل نیست
فعل جاعل خلاف قابل نیست

سرِّ قدر کو سمجھنے کے لئے بس ان ہی چند قضایا کا سمجھ کر تسلیم کر لینا کافی ہے۔ ہماری رائے میں ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس سے کسی کو اختلاف ہو سکتا ہو۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات ازل سے ثابت ہے۔ وہ ازل سے عالم بھی ہیں یعنی صفتِ علم سے موصوف ہیں۔ چونکہ علم کے لئے معلوم کا ہونا ضروری ہے لہٰذا معلوماتِ حق بھی ازلی ہیں اور غیر مجعول۔ معلوماتِ ہی 'ماہیاتِ اشیاء' یا ذواتِ ممکنات کہلاتے ہیں۔ جب معلومات ازلی ہیں تو ان کی ساری قابلیات بھی ازلی ہوں گی۔

اب تخلیق کا تعلق ارادہ سے ہے۔ تخلیق ارادہ کا عمل ہے۔ حق تعالیٰ کا ارادہ ان کے علم کا تابع ہوتا ہے۔ ان کا ہر فعل تحتِ حکمت ہوتا ہے اور اس کے لئے فعل کو علم تابع ہونا ضروری ہے۔ تخلیق نام ہے حق تعالیٰ کے معلومات یا اعیان کے خارج میں انکشاف کا۔ جو چیز خارج میں منکشف ہو رہی ہے وہ بہ حیثیت تصور یا "معلوم" علمِ الٰہی میں ازل سے موجود ہے۔ ان ہی معلومات یا تصورات یا اعیان کا جب خارج میں تحقق ہوتا ہے تو ان کا نام 'اشیاء' ہوتا ہے۔ اشیاء واقعاً معلوم ہیں۔ خارجاً مخلوق ہیں اپنی انفرادیت اور تعین و تشخص کے لحاظ سے غیرِ ذاتِ حق ہیں۔ ذاتِ حق تمام تعینات و تشخصات سے منزّہ ہے۔ لیس کمثلہ شیٔ وھو السمیع البصیر

اب ان حقائق کی روشنی میں حدیثِ جبر و قدر پر نظر ڈالو تو تخلیق حق تعالیٰ کی طرف سے ہو رہی ہے لیکن اشیاء کے اقتضاءات یا قابلیات کے مطابق ہو رہی ہے۔ اشیاء کی یہ قابلیات بے جعل جاعل ہیں یعنی

غیر مخلوق و ازلی ہیں۔ ان کو کسی نے مجعول نہیں کیا۔ یہ اپنے اقتضائے ذاتی کے لحاظ سے مستقل و مختار ہیں نہ کہ مجبور۔ یہی باریک بات جبری کی سمجھ میں نہیں آتی وہ اپنے عین یا ذات کو بھی مجعول و مخلوق خیال کرتا ہے اپنی خصوصیات و قابلیات کو بھی آفریدہ سمجھتا ہے۔ حالانکہ یہ معلوم الٰہی ہونے کی وجہ سے ازلی ہیں۔ اگر یہ ازلی نہ ہوں بے جعل جاعل مجعول ہوں تو ضروری ہوگا کہ قبل میں سلب ہوں گے، جو چیز سلب ہو وہ ہمیشہ سلب ہوگی موجود نہیں ہو سکتی۔ ورنہ قلب حقیقت لازم آئے گا، اور یہ محال و باطل ہے۔ اگر جبری اس نکتہ کو سمجھ لے تو وہ ہرگز یہ نہ کہے گا کہ میری فطرت اس طرح کیوں بنائی گئی۔ فطرت جس کو ہم اصطلاحی الفاظ میں عین ثابتہ یا معلوم کہہ رہے ہیں بنائی نہیں گئی، وہ مجعول ہی نہیں ہے، اور اس کے تمام اقتضاءات و قابلیات بے جعل جاعل ہیں۔ اور اس طرح وہ اپنے اقتضائے ذاتی کے لحاظ سے مستقل و مختار ہے۔ لیکن ان قابلیات و خصوصیات کو حق تعالیٰ خارج میں ظاہر کر رہے ہیں، وجود بخشی ان کی جانب سے ہو رہی ہے۔ تخلیق ہمیشہ اللہ ہی کا فعل ہے۔ "خلقکم وما تعملون"۔

اوپر جو کچھ کہا گیا اس کو ایک جملہ میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ یہی معنی ہیں قول شیخ کے:

"لا یمکن لعین ان یظہر فی الوجود ذاتاً وصفۃً وفعلاً الا بقدر خصوصیتہ واہلیتہ واستعدادہ الذاتی"۔ (شیخ اکبر)

یہاں جبر و قدر دونوں میں تطبیق ہو رہی ہے۔ اعیان ثابتہ جو معلومات حق ہیں (اور حق تعالیٰ ان کے عالم ہیں) اپنی خصوصیات و قابلیات و استعدادات کے موافق ظاہر ہو رہے ہیں۔ یہ ہے اختیار اور آزادی کا پہلو۔ لیکن ان کا ظہور حق تعالیٰ سے ہو رہا ہے، یہ ہے جبر کا پہلو۔

دیکھو حرکت ایک ہے اور نسبت دو۔"

ایک نسبت حق کی جانب ہے۔ یہ نسبت تخلیق ہے۔ جملہ افعال کی تخلیق حق تعالیٰ کر رہے ہیں۔ فاعلِ حقیقی وہی ہیں۔ ذاتِ خلق میں نہ حرکت ہے نہ قوت؛ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ یعنی حرکت ۔۔ تخلیقِ افعال میں انسان مجبور ہے "ہمہ از دوست"۔

دوسری نسبت خلق کی جانب ہے۔ یہ نسبت "کسب" ہے یعنی افعال کی تخلیق عینِ ثابتہ یا ماہیتِ شے کے بالکل مطابق ہو رہی ہے، بالفاظِ دیگر جو کچھ عین میں ہے یہ فعلیت خالق وہی ظاہر ہو رہا ہے، یا یوں کہو ہر شے کی فطرت کے مطابق ظہور ہو رہا ہے جب تمام وقوعات میری اقتضا کے موافق ہو رہے ہوں اور کوئی شے میری فطرت کے خلاف مجھ پر عائد نہیں کی جا رہی ہے تو میں صحیح معنی میں آزاد ہوں۔ اسی لیے شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ ما یحکم علینا الا بنا بل نحن نحکم علینا بنا۔ "جو کچھ ہم پر حکم لگایا جا رہا ہے، وہ ہماری فطرت کے مطابق ہے، بلکہ خود ہم اپنی ہی اقتضاء کے مطابق حکم لگا رہے ہیں۔" یہ ٹھیک قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق ہے: "اٰتٰکم من کل ما سالتموہ[۱]" یعنی وہ سب کچھ تم کو اس نے دیا جس کو تمہارے عین نے لسانِ استعداد سے مانگا۔" دوسری جگہ اور زیادہ صاف طور پر بیان کیا گیا ہے:

"انا لموفوھم نصیبھم غیر منقوص[۲]" ثلثہ الجزء۔ اب الف[۳]
"ہم ان کا حصہ پوری طرح بغیر کسی نقصان کے دیتے ہیں۔" صاحبِ گلشنِ راز حق تعالیٰ کی زبانی کہلواتے ہیں:

---

۱ پ ۱۳ ع ۱۱ ۲ پ ۱۲ ع ۹ ۳ ش ع ۵

ہرچہ از زیبا و زشت شما است
بر سرِ مقتضائے عین شما است

ہرچہ عین شما تقاضا کرد
جود و فیض حق آن ہویدا کرد

ہر شخص کا عین گویا ایک کتاب ہے جس میں اس کی تمام خصوصیات و قابلیات ذاتیہ درج ہیں۔ حق تعالیٰ کی تخلیق اس کے عین مطابق ہوتی ہے۔ جامی سامی نے اس کو بڑی خوبی سے ادا فرمایا ہے۔

"اے عین تو نسخۂ کتاب اول
مشروع دراں صحیفہ اسرار ازل

احکام قضا چو بود در وے بجمیع
حق کرد باحکام کتاب تو عمل

اسی مفہوم کو اور زیادہ اصطلاحی زبان میں ادا کرو تو بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے اور تمام مسئلہ کی تلخیص حاصل ہو جاتی ہے۔ "اعیان یا ماہیات در اصل معلوماتِ حق ہیں اور حق تعالیٰ کا علم اپنے معلومات کا تابع ہوگا" وللہ در من قال ؎

حق عالم و اعیان خلائق معلوم
معلوم بود حاکم و عالم محکوم

بر موجب حکم تو کند با تو عمل
گر تو بشنو معذبی و مرحوم

(جامی)

اس طرح حکم قدر عین ثابتہ کی طرف ہی رجوع ہوتا ہے یعنی تخلیق حق

"تابع تقضائے آثار عین ثابتہ ہے"۔ اسی لئے کہا گیا ہے۔ "القــلـم ما انت
والحکـمــلــک" بلا شک اب اس راز کے معلوم ہو جانے کے بعد ہمیں
ایک سکون حاصل ہو جاتا ہے اور غیر کے تعلق سے ہم کٹ جاتے ہیں خیر و شر بوجہ
اپنی ہی ذات کو قرار دیتے ہیں۔ "از ماست کہ بر ماست" کے معنی ہم پر کھل
جاتے ہیں۔ نہ ظلم کی نسبت خدا نے تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں (کیونکہ "ظلم بشد
ز فعل او مسلوب"۔ ان اللّٰہ لیس بظلام للعبید[1]) نہ اپنے زمانے ہی کو
ملعون و مطعون قرار دیتے ہیں، اور نہ ماحول ہی کو بدنام کرتے ہیں بلکہ ذمہ داری
اپنے کندھوں پر لیتے ہیں اور اپنے ہی نفس کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:-
"یداک کسبتا و فوک نفخ" "تیرے ہی دونوں ہاتھوں نے
کمایا ہے اور تیرے ہی منہ نے پھونکا ہے۔" سچ ہے۔
"وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم[2]"
جبر و قدر کی اس تلخیص کے بعد جب ہم علامہ اقبال
کی طرف رجوع کرتے ہیں تو یہاں بھی یہی حل ہمیں ملتا ہے۔ لیکن طرز بیان مختلف
ہے اور اصطلاحات جدا ہیں۔ مگر تضاد اس شدت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے
اور توضیح میں اس قدر اجمال سے کام لیا گیا ہے کہ تضاد بیانی تو نمایاں نظر آتی
ہے لیکن تطبیق کا نشان غائب ہو جاتا ہے۔ آپ کی فلسفیانہ کتاب (Recons
truction) میں دو ایک عبارتیں ایسی واضح مل جاتی ہیں کہ اگر
اقبال اُن کی توضیح میں ذرا تفصیل سے کام لیتے تو بات کے سمجھنے میں زیادہ آسانی
ہو جاتی تاہم اقبال طرح کے مطابق حل ضرور پیش کرتے ہیں۔ گو اجمالی طور پر۔ اسی

---

[1] پ ع ۱۰

[2] پ ۲۵ ع ۵

اجمال کو بیان کسی قدر کھولا جا رہا ہے۔
اپنی مذکورہ بالا کتاب میں "تقدیر" کی توضیح میں اقبال کہتے ہیں:۔

"As the Quran says:-" "Good created all things and assigned to each its destiny. The destiny of a thing, then, is not an unrelenting fate working from without like a task master; it is the *inward reach of a thing, its realizable possibilities which lie within the depths of its nature and socially actualize themselves without any feeling of external compulsion.*"

(Ibid pp 67-78)

یعنی جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے "خلق کل شیء وقدرہ تقدیرا"
تقدیر کوئی وقت قاہرہ نہیں جو خارج سے شے پر بجبر عمل کر رہی ہو۔ بلکہ وہ خود شے کی باطنی رسائی ہے اس کے وہ قابل تحقیق امکانات ہیں جو اس کی فطرت میں مضمر ہیں جو بغیر کسی خارجی جبر کے اپنے وقت پر ظاہر ہوتے ہیں۔"

اسی ایک عبارت پر غور کیا جائے تو ظاہر ہو گا کہ اقبال شی کی قابلیات اور اقتضاآت کو یا ان کے الفاظ میں "قابل تحقق امکانات" ہی کو اسکا "اختیار" قرار دے رہے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اقتضاآت غیر مجعول و غیر مخلوق ہیں اور چونکہ ان ہی اقتضاآت کا خارج میں (بفعلیت خالق) ظہور ہو رہا ہے بنا بر ذات شی پر کوئی جبر و اکراہ نہیں ہو رہا ہے اور اسی معنی میں "وہ آپ ہے تقدیر الٰہی"؎ شیخ اکبر نے اسی مفہوم کو اس طرح ادا کیا تھا کہ "ان الحق لا یعطیہ

؎ اقبال بال جبریل۔

الاہما عطاہ علینہ" حق تعالیٰ شئی کو وہی عطا فرماتے ہیں جو اس کے عین (یعنی معلوم) کا تقاضا ہے۔ اقبال اسی چیز کو دوسرے رنگ میں پیش کر رہے ہیں

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

(بالِ جبریل)

انسان اس معنے میں مجبور نہیں کہ اس کی "قابلیات" یعنی تخلیق الٰہی قرار دیے جائیں۔ انسان کی فطرت یا ماہیت بالفاظ دیگر اس کا "عین" (معلوم الٰہی) ہونے کی وجہ سے جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا ہے، غیر مخلوق ہے، اور اسی نے اس کو اختیار اور آزادی حاصل ہے، اپنے الفاظ میں شاید اقبال اسی مضمون کو ادا کر رہے ہیں ؎

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں
ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی

(بالِ جبریل)

حق تعالیٰ کی قدرت مطلقہ و مشیت بالغہ کا لحاظ کرتے ہیں کہ اقبال دل و جان سے قائل ہے اس شعر کی توجیہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے جو ہم نے پیش کی ہے؟

آزادی اور اختیار کے اس مفہوم کے ساتھ جبر کا وہ مفہوم بھی یاد رکھو جو اقبال نے "ہمہ از دوست" کے معنی میں لیا ہے اور تخلیق کی نسبت حق تعالیٰ کی جانب کی ہے تو تمہیں اس تضاد کی تطبیق سمجھ میں آنے لگتی ہے جس کو ہم نے دو جملوں میں ادا کیا ہے "الخلق من الحق والکسب من الخلق" یہی معنی ہیں اس مشہور قول کے جو امام جعفر صادق کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، "لا جبر ولا قدر بل الامر بین الامرین"

بشنو سخن مشکل و سرّ مغلق | فعل و صفت کہ باشد بانسان ملحق
از یک جہت آن جملہ صفات است بما | از وجہ دگر جملہ صفات است بحق

(جامی)

اگر آپ نے سرِّ قدر کو سمجھ لیا ہے تو آپ کی سمجھ میں یہ بھی آجائے گا کہ کیوں "مومنین" جبر کے معنی "تخلیق من اللہ" لے کر ایک قسم کی قوت و طمانیت محسوس کرتے ہیں اور کیوں جاہل جبر کو سلب آزادی سمجھ کر ضیق میں گرفتار ہو کر اباحت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ قاضی محمود بحری کے انہیں نفیس اشعار میں سے ایک شعر اقبال اپنے مکالمہ میں پیرؔ کی زبانی کہلواتے ہیں۔

جبر باشد پردۂ اہلِ کمال! | جبر ہم زندان و زنجیر جاہلاں!
بال بازاں را سوئے سلطان برد! | بال زاغاں را بگورستان برد!

خواجہ غلام السیدین

اقبال[1] کا نظریۂ ادب

اقبال کا نظریۂ ادب کیا ہے؟ اس کے نزدیک ادب اور زندگی کا کیا تعلق ہے؟ ادیب اور شاعر کو زندگی کی جد و جہد اور کشمکش میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ اس پر بحیثیت ایک ادیب کے کیا فرائض عاید ہوتے ہیں؟ اگر اس سوال کا جواب ادب کی مشکل اصطلاحوں میں دیا جائے تو وہ بہت لمبا اور ٹکنیکل ہو جائے گا اس لیے سیدھے سادے الفاظ میں سن لیجیے۔

بعض لوگوں کا خیال تو یہ ہے اور رہا ہے کہ جب انسان زندگی کی کٹھن آزمائشوں اور تکلیفوں سے عاجز آ جاتا ہے یا ہمت اور حوصلہ کی کمی کی وجہ سے ان کا مقابلہ ہی نہیں کر سکتا تو وہ اپنے اصلی اور واقعی ماحول سے بھاگ کر ادب اور شاعری کے دامن میں پناہ لیتا ہے اور وہاں اپنے جذبات اور خیالات کی ایک چھوٹی سی ستھری اور خوبصورت دنیا بسا لیتا ہے اور اس تخیل کو حقیقت پر ترجیح دیتا ہے اگر آپ دنیا کے ادب کا مطالعہ کریں تو ماننا پڑیگا کہ اکثر ادیبوں پر یہ تعریف پوری اترتی ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کی دنیا سے جہاں تک ممکن

---

[1] بشکریہ آل انڈیا ریڈیو۔

ہوتا ہے بے تعلق ہو جاتے ہیں۔ ان کے ملک میں آگ لگی ہو لیکن وہ روم کے شہنشاہ نیرو کی طرح بیٹھے بانسری بجاتے ہیں۔ یہ وہ بزرگ ہیں جن کی شان میں اقبال نے خود کہا ہے

شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق
افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار

ان میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا دل زیادہ حساس تھا اور وہ گردوپیش کے حالات اور واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے لیکن انھوں نے اس اثر کا اظہار محض آنسوؤں اور آہوں اور دنیا کی نا اہلیت پر گریہ و زاری کی شکل میں کیا۔ البتہ انہوں نے ان جذبات کو شعر اور ادب کے قالب میں ڈھال کر دلکش اور اثر آفریں ضرور بنا دیا لیکن یہ لوگ بھی دراصل زندگی سے گریز کر کے ادب کی سرزمین میں پناہ لینا چاہتے تھے۔ وہ اس آہ و زاری کے ذریعے اپنے جذبات کی شدت کو ظاہر کر کے سکون حاصل کر لیتے تھے اور کچھ کرنے کی ذمہ داری سے آزاد ہو جاتے تھے۔ وہ لوگ بھی جو اس ادب کے قدردان تھے جذبات کے اظہار کو عمل کا بدل قرار دیتے تھے کیونکہ یہ ادب اور شاعری عمل کی قوت کو کم کرتی ہے بڑھاتی نہیں۔ اس کی تہ میں یہ عقیدہ پنہاں ہے کہ فن کار ہمیشہ اپنے ماحول سے شکست کھاتا ہے اور زندگی کی عملی کشمکش میں شریک ہونے سے اس کی قوت تخیل اور نظر کی رسائی کم ہو جاتی ہے۔

جو ادب اس نظریہ پر مبنی ہے وہ محض ادیب اور شاعر کے ذاتی جذبات اور احساسات کا نقشہ کھینچتا ہے اور اجتماعی زندگی سے بیگانہ ہوتا ہے۔ آپ بیتی بیان کرتا ہے جگ بیتی سے سروکار نہیں رکھتا۔ ممکن ہے اس کے چاروں طرف

نہایت زبردست سیاسی، سماجی اور تمدنی تحریکیں دنیا کے نظام کو درہم برہم کر رہی ہوں لیکن وہ شعوری طور پر ان سے متاثر نہیں ہوتا۔ اس کے اپنے چھوٹے سے دل کی خلش عالمِ انسانیت کے دکھ درد پر غالب ہو جاتی ہے اور اس دل کے ٹوٹنے کی صدائیں (جس کو ممکن ہے کسی نہایت نااہل خیالی محبوب نے توڑا ہو) تمام انسانی ہنگاموں کا شور غالب ہو جاتا ہے۔ وہ اس نفسیاتی اور ادبیاتی مردہ اصول پر کاربند رہتا ہے کہ "ادب کو ادب کی خاطر" ہونا چاہیے! اس کو زندگی کی آگ میں کودنے سے کیا کام؟ اقبال ایسے ہنرمندوں سے بھی بیزار ہے ؎

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار

موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں
زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار

چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

جہاں تک موجودہ دور کا تعلق ہے حالی پہلا شاعر تھا جس نے جان بوجھ کر اور سوچ سمجھ کر اردو شاعری کے دھارے کا رخ بالکل پلٹ دیا اور جو شاعری دورِ زوال میں شاعروں کے چھوٹے اور اوچھے جذبات کا کھیل بن کر رہ گئی تھی اس کو قومی زندگی کے عروج و زوال کا ترجمان بنا دیا۔ اقبال شاعری کے اسی نظریہ کا معترف ہے۔ وہ گریز کا مخالف ہے اور چاہتا ہے کہ شاعر اور ادیب بھی دوسرے زندہ انسانوں کی طرح زندگی کے پُرآشوب سمندر میں تیرنا سیکھیں۔ یہ زندگی کبھی کڑوی ہے کبھی میٹھی۔ کبھی کامیابی و ارجمندی سے ہم آغوش ہے

اور کبھی ناکامی اور حسرت کا منہ دکھاتی ہے۔ لیکن انسان کی سیرت اسی کشمکش میں ڈھلتی ہے اور شاعر اور ادیب اسی آگ میں تپ کر کندن بن سکتے ہیں ۔

سکندر با خضر خوش نکتہ گفت
شریک سوز و ساز بحر و بر زی
تو ایں جنگ از کنار عرصہ بینی
بمیر اندر نبرد و زندہ تر زی

بہر حال اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ جو ادیب اس جنگ سے بھاگے گا وہ شاید ادب کو الفاظ کا کھیل بنائے اپنا اور اپنے جیسے بے ہمت اہلِ ہجو کا دل بہلائے لیکن اس کی تحریریں وہ قوت اور جوش اور خلوص نہیں پیدا ہو سکتا جو افراد اور اقوام کی تقدیر بدل دیتا ہے۔ وہ ساحل کی سلامتی سے رزمِ خیر و شر کو دیکھتا ہے اور ساحل کے رنگ ریزوں سے کھیلتا ہے لیکن نہ طوفان کے تھپیڑے کھاتا ہے نہ اس کو موتی ہاتھ آتے ہیں ۔ ادب اس وقت حیات آفریں بنتا ہے جب اس کے ہاتھ میں زندگی کی نبض ہو اور وہ انسان کے دل میں زندگی کے امکانات اور اس کے حسن و شوکت کا زیادہ گہرا احساس پیدا کرے۔ اقبال ہی کی زبان سے اس حقیقت کی تفسیر سنیے :-

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

لہٰذا وہ ادب میں بھی ضرب کلیمی کی شان پیدا کرنا چاہتا ہے جو انسانوں میں اپنی غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کا ولولہ پیدا کر دے اور ان کی کھوئی ہوئی یا سوئی ہوئی خودی کو بیدار کر دے۔ اس کے نزدیک ادب اور تمام فنون لطیفہ کا اعلیٰ ترین مقصد خودی کا استحکام ہے جو ادب انسان کو اس کی خودی سے بیگانہ کرتا ہے اور تسخیر عالم کے لئے اس کو آمادہ نہیں کرتا وہ انفرادی اور قومی زندگی کے لئے ہلاکت کا پیغام ہے۔

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیر فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

مشرق کے شاعر کے اس بلند اور اہم فرض کا احساس کرتے ہوئے وہ اس کو ان الفاظ میں دعوت عمل دیتا ہے۔

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاج نفس نے
شاعر ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے
تاثیر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم

اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی لے
شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو
شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تری مے
ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تخت جم و کے
ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے!

اور پھر اقبال کا ادیب اور شاعر صرف اپنے ذاتی جذبات کی نمائش نہیں کرتا بلکہ اس کے کلام میں عالم انسانیت کا دل دھڑکتا ہے وہ تمام قوتیں اور تحریکیں جو انسانوں کو بحیثیت انسان کے متاثر کرتی ہیں اور ان کی تقدیر کو بناتی یا بگاڑتی ہیں، اس کے دل کے تاروں کو چھیڑتی ہیں اور جب یہ نغمہ ادب خوردۂ عشق بن کر نکلتا ہے تو انسانوں کے لئے شمع ہدایت بن جاتا ہے۔

اقبال کا اپنا کلام اس اصول کی بہترین مثال ہے ——— کون سے اہم مسائل تھے جن سے اقبال نے اپنی شاعری میں بحث نہیں کی، فلسفہ، سیاست، معاشرت، مذہب، تعلیم سبھی اس کا میدان تھے لیکن اس کی شاعری کا اعجاز ہے کہ اس نے ان اہم اور دقیق مسائل کو شعر کے قالب میں اس خوبی سے ڈھالا کہ ان کی شعریت میں فرق نہ آیا ....

تمام ادیبوں اور شاعروں کے لئے اس کا پیغام یہی ہے کہ وہ انسانیت کے بلند ترین مقاصد کی ترجمانی کریں اور ان کے حصول کے لئے جو جدوجہد جاری ہے، اس میں ذمہ داری کے فرائض انجام دیں اور اپنی گوشہ نشینی اور آسائش پسندی کو چھوڑ کر اس عظیم الشان انسانی جہاد میں شریک ہوں۔

اے میانِ کیسہ ات نقدِ سخن
بر عیارِ زندگی خود را بزن

مدتے غلطیدہ اندر حریر
خو بکرپاسِ درشتے ہم بگیر

مثلِ بلبل ذوقِ شیون تا بکے
در چمن زاراں نشیمن تا بکے

اے ہما از یمنِ دامت ارجمند
آشیانے ساز بر کوہِ بلند

"نئے ادب" اور "ترقی پسند ادب" کی جو مفید تحریک ہندوستان میں چل رہی ہے۔ اس پر اقبال کا یہ احسان ہے کہ اس نے اپنے بعد آنے والے ادیبوں کی توجہ کو قومی اور اجتماعی مسائل کی طرف پھیرا تھا اور انھیں محض ذاتی جذبات اور محرومات کے بندھنوں سے نجات دلائی تھی۔ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض تنگ نظر یا ناسمجھ لوگ محض اس کے طرزِ بیان سے یا اس کی مذہبیت سے بدظن ہو کر اس بات کا اعتراف نہ کریں یا وہ اس بے لاگ تنقید اور محاکمہ سے جو قدیم اور جدید دونوں کو پرکھتا ہے، چراغ پا ہوں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر حالی اور اقبال نے اردو شاعری اور ادب کو یہ نیا راستہ نہ دکھایا ہوتا تو جدید ادب کے علمبردار معلوم کن بھول بھلیوں میں گم ہوتے۔ محض دوسرے ملکوں کی تقلید سے راستہ پائیں اور کوئی پائیدار کامیابی حاصل کرنا ممکن نہیں۔ جب تک ہم اپنی خودی کے سوتوں کو تلاش نہ کریں اور ان کی قوت سے کام نہ لیں۔

میرے شرر میں بجلی کے جوہر لیکن نیستاں تیرا ہے نمناک

تیرا زمانہ تاثیر تیری
ناقص نہیں یہ تاثیرِ افلاک

کامل وہی ہے رندی کے فن میں
مستی ہے جس کی بے منتِ تاک!

رکھتا ہے اب تک میخانۂ شرق
وہ مے کہ جس سے روشن ہو ادراک

اہلِ نظر ہیں یورپ سے نومید
ان امتوں کے باطن نہیں پاک!

سید وحید اللہ وحید
(قادری)

اقبال حضورِ رسالت میں
انسانِ کامل سے ان کا قلبی ربط اور نعت

در جہاں شمعِ حیات افروختی
بندگاں را خواجگی آموختی

کائنات میں آپ ہی نے شمعِ حیات روشن کی، غلاموں کو سرداری سکھائی۔
اُردو اور فارسی شاعری کے ہر دور میں نعت گوئی کا سلسلہ برابر جاری
رہا۔ ان ہر دو زبانوں میں نعت شریف کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ ہر دور کے بہترین
شعراء قدر و منزلت اس سعادت میں شریک ہوتے رہے۔ دورِ حاضر کے
شاعرِ اعظم علامہ اقبال نے بھی اپنی مخصوص عظمت کے شایانِ شان پورے جوش
و خلوص سے اس میں حصہ لیا۔ اس لحاظ سے بھی کہ وہ مشرق کے شاعرِ اعظم تھے
اس اعتبار سے بھی کہ وہ انسانیت کا پیغام پہنچا رہے تھے۔ ان کا یہ پیغامِ انسانیت

.... ناقص رہ جاتا اگر ان کا تصور انسان کامل تک رسائی حاصل نہ کرتا

علامہ اقبال کو ذاتِ رسالت مآبؐ سے غیر معمولی عشق و محبت تھی۔ ان کے حکیمانہ دل و دماغ نے یہ محسوس کر لیا کہ محبتِ نبویؐ کے بغیر سارا علم و عمل حجاب ہی حجاب ہے کیونکہ انسانیت کی حقیقی تعمیر کے لئے جس فکر و عمل کی ضرورت ہے اس کا منبع اور مرکز ذاتِ رسالت مآبؐ ہی ہے:

ایں ہمہ از لطفِ بے پایانِ تو
فکرِ ما پروردۂ احسانِ تو

(سب کچھ آپ کی عنایتِ بے پایاں ہی سے حاصل ہوا ہماری فکر آپ کی آغوشِ احسان کی پروردہ ہے)

علامہ اقبال کا یہ عشق ان کے ترقی پذیر کلام کے ساتھ ساتھ تدریجاً نکھرتا اور ترقی کرتا گیا تا آنکہ جب ان کا کلام انتہائی بلندیوں پر پہنچا تو ان پر مقاماتِ "نبوتِ کبریٰ" بھی اسی لحاظ سے منکشف اور منضبط ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضورؐ کا نام مبارک یا ذکرِ مبارک کسی کی زبان پر آجاتا تو ان کی آنکھیں اشک آلود ہو جاتیں۔ ان کی زندگی کے آخر کا ذکر ہے کہ یومِ اقبال کے موقع پر مولوی اسلم صاحب جیراجپوری نیاز حاصل کرنے کے لئے گئے تھے۔ وہ اپنی اس ملاقات کا ذکر "جامعہ" میں یوں کرتے ہیں "دوسرے دن ہم ڈاکٹر اقبال سے ملے جو ہمارے منتظر تھے۔ ۹ بجے تھے سلسلۂ گفتگو ۱۲½ بجے تک رہا۔ اس سال حج کی شرکت کا ارادہ رکھتے تھے مگر بیماری اور کمزوری کی حالت یہ تھی کہ کوٹھی سے باہر نکلنا مشکل تھا۔ کہتے تھے کہ میں دو سال سے ارادۂ سفرِ حج میں ہوں بلکہ وہ اشعار بھی لکھ لئے ہیں جو سفر سے متعلق ہیں۔ ان میں سے کہیں کہیں سے کچھ سنایا بھی۔ مکے مدینے کی روانگی کے وقت ایک غزل لکھی ہے جس میں اللہ کو مخاطب کر کے

کہتے ہیں ؎

تو باش ایں جب وبا خاصان بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

یہ شعر سناتے ہی گریہ ایسا گلو گیر ہو گیا کہ آواز بند ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شعر بالکل آیۂ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ (بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں) کے مفہوم کا پُر کیف احساس ہے۔

نعت کے پاکیزہ موضوع پر علامہ اقبال کی مستقل نظمیں موجود ہیں ان کے علاوہ مختلف نظموں، رباعیوں اور غزلوں میں کہیں جستہ جستہ اور کہیں مسلسل شعر بھی پائے جاتے ہیں۔ اسی سرمایۂ نجات و فلاح میں ایسے ایسے درِ شہوار موجود ہیں کہ آئندہ اہلِ دل اور اہلِ نظر کسبِ ضیا کریں گے۔ ملاحظہ ہو

"عندلیبِ باغِ حجاز" اپنے سینائے دل کی فضاؤں میں گرمِ پرواز ہو کر بارگاہِ صمدیت میں یوں شرفِ مخاطبت حاصل کرتا ہے ؎

شکر شکوے کو کیا حسنِ ادا سے تو نے
ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

بارگاہِ قدس سے اپنے حبیبؐ کی نعت و ثنا میں ڈوبی ہوئی ندا آتی ہے ؎

خیمہ افلاک کا ایستادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے
قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

ذکرِ نبی کی ابدیت اور رفعت کی نوید سنائی جاتی ہے ۔

چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رفعنا لک ذکرک دیکھے

اقبال کوئے حبیب کا سکندر دماغ گدا ہے ماشاء اللہ کیا شانِ گدائی ہے
کہ شوکتِ سلاطین اس کا طواف کرے ۔

کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغِ سکندری

سبحان اللہ کیا سرفرازی ہے کہ فرشتے بارگاہِ رسالت میں لے جاتے
ہیں ۔ "عندلیبِ باغِ حجاز" یوں مخاطبت کی عزت حاصل کرتا ہے ۔

کہا حضور نے اے عندلیبِ باغِ حجاز
کلی کلی ہے تری گرمیٔ نوا سے گداز

اقبال کا قلبِ صافی آٹھوں پہر سرخوشِ جامِ ولائے محمدؐ ہے اسکی
شکست اور فتادگی غیرت دہ سجدہ ہائے نیاز ہے ۔

ہمیشہ سرخوشِ جامِ ولا ہے دل تیرا
فتادگی ہے تری غیرتِ سجودِ نیاز

حضورِ رسالت مآب میں آبگینۂ دل نذر پیش کرتا ہے جس میں امت
کی آبرو اور طرابلس کے شہیدوں کا خون چھلک رہا ہے ۔

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

حضرت صدیق اکبرؓ جن کا سینہ آتشِ عشق و محبت کا مجمر تھا ۔ ایک دن اپنا
سرمایۂ روزگار حضورِ نبوی میں خدمتِ اسلام کے لئے پیش کرتے ہیں

ان کے احساس عبدیت کی ترجمانی حضرت اقبال کی زبان سے سنیے۔

اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر
اے تیری ذات باعث تکوین کائنات
پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسول بس

حضرت بلالؓ جن کی فطرت "نور نبوت" سے "مستنیر" تھی ان کے قلب جان و دل کا بیان کیا خوب ہوا۔

نظر تھی صورت سلماںؓ ادا شناس تری
شراب دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری

حضرت بلالؓ کو مثل کلیم نظارہ کا سودا تھا

تجھے نظارے کا مثل کلیم سودا تھا
اویس طاقت دیدار کو ترستا تھا

ادائے دید کے پردہ میں "نیاز" و "ناز" کی یکجائی کا نقشہ کس خوبی سے کھینچا ہے۔

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری
کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری

اشتیاق دید کی سعادت میں اقبال کا دل کس درجہ شریک ہے اس کا اندازہ کیجیے۔

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا
خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا

سیرت طیبہ میں معراج ایک مسلّم بالشان حقیقت ہے۔ اس کا فیضان

بقدر ظرف وہمت ہر مسلم پر عام ہے۔

رہِ یک گام ہے ہمت کیلئے عرش بریں کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

"نکتۂ معراج سرِ سراپردۂ جاں" ہے جس نے اس نکتہ کو سمجھا رفعت فکر کی ثریا اس کا ہدف بنی۔

ناوک ہے مسلمان ہدف اس کا ہے ثریا
ہے سرِ سراپردۂ جاں نکتۂ معراج

جس نے اس نکتہ کو نہ سمجھا اس کا مد و جزر چاند کا محتاج رہا تو معنی والنجم نہ سمجھا تو عجب کیا ہے ترا مد و جزر ابھی چاند کا محتاج ہے۔ کہیں ملت مرحوم کی تباہ حالی پر اقبال بارگاہ روح نبوی میں عرض کرتے ہیں

شیرازہ ہوا ملت مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

اس راز کو اب فاش کر اے روح محمدؐ
آیات الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

اور عرض کیا گیا ہے جوں جوں اقبال کا ربط محبت ذات نبوت سے بڑھتا گیا ان کے قلب مجلی پر مقامات نبوت کا انکشاف ہوتا گیا یہاں تک کہ انا من نور اللہ کل خلقھم من نوری (میں اللہ تعالیٰ کے نور سے ہوں اور تمام مخلوق میرے نور سے) کے جاودانی کیف وسرور کو اقبال کی بصیرت نے پالیا اور ان کی یہ بصیرت اس قدر بلند ہوئی کہ بصارت پر چھا گئی اب وہ خودی کی خلوتوں میں کبریائی اور اس کی جلوہ میں مصطفائی کو تماشا بے حجاب کرنے لگے

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی

ظاہرش زیں جلوہ ہائے دل فروز
باطنش از عارفاں پنہاں ہنوز

اس موضوع پر بہت علامہ اقبال کی فارسی نظموں میں نہایت لطیف اور نازک مضامین زیادہ آتے ہیں۔ ان سب کا احاطہ اس موقع پر ناممکن ہے اس لیے فارسی کے چند شعر پیش کر کے مضمون ختم کیے دیتے ہیں۔

حضور کا ظہور زندگی کا شباب ہے۔ آپ کے جلوے کے بغیر زندگی ایک خواب بے تعبیر ہے۔

اے ظہور تو شباب زندگی
جلوہ ات تعبیر خواب زندگی

حضور کے ظہور نے کائنات کے مدارج بلند و بالا کر دیئے۔ آپ کی دولت فقر نے کائنات کو ابدی حقائق کا سرمایہ دار بنا دیا۔ فقر محمدی کو سرمایۂ کائنات کہنا حقیقت کی کتنی پاکیزہ تعبیر ہے۔

از تو بالا پایۂ ایں کائنات
فقر تو سرمایۂ ایں کائنات

حقیقی فقر و شاہی اسی ذات کے فیضان سے ہے۔ یہ ساری تجلیاں اسی جلوے کی دریوزہ گری سے مالا مال ہیں۔

فقر و شاہی وارداتِ مصطفیٰ
ایں تجلیہائے ذاتِ مصطفیٰ

"الفت گری" حضور کا مقام خصوصی ہے۔ اس مقام تک رسائی

انسان کا کمال اور معراج ہے۔ حضورؐ کا آشکارا دیدار اور حضورؐ کی حقیقت کا وضح ادراک ہماری سیر اور معراج کا منتہا ہے اور ہم حضورؐ کے ضمیرِ پاک میں ہی مسجدِ اقصٰے (انتہائی مقامِ عبدیت) پا لیتے ہیں۔

آشکارا دیدنش اسرائے ما

در ضمیرش مسجدِ اقصائے ما

قندھار میں حضورؐ کے خرقۂ مبارک کی زیارت کے بعد اقبال کے جذبات کا ارتعاش اور جذبات کا تلاطم دیکھیے

قصہ اندر سینہ ام زود رجوں

تا ز راہِ دیدہ می آید بروں

بوئے پیرہن پاک سے اُن کی مشامِ جاں معطر ہو جاتی ہے تو کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔

آمد از پیراہن او بوئے او

دادِ ما را نعرۂ اللہ ھو

آپ حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت بلالؓ کے سرودِ محبت و کیفِ افزائی سے محظوظ ہو چکے ہیں۔ اب ذرا ابوجہل کے نوحۂ ہزیمت و شکست کو بھی گوشِ گزار فرما لیجیے۔ عہدِ جاہلیت کے افکار و عادات کے خلاف اسلام نے وحدت، اخوت، مساوات وغیرہ کی جو تعلیم دی ہے وہ متکبر مخالفین کے خیال میں نظمِ عرب کی تباہی کا باعث تھی۔ ابوجہل اس پر نوحہ کرتا ہے۔ حضورؐ حیات اور محاسنِ اسلام کا ذکر ابوجہل کے نوحہ میں نعت گوئی کا نادر پیرایہ ہے۔

متکبر ترے اثر آخر کا مشاہدہ کیجیے۔

سینۂ ما از محمد داغ داغ
از دمِ او کعبہ را گل شد چراغ

اپنے تصورِ جہالت کے خلاف آواز سے بوجہل کا دل و دماغ متحمل نہیں اس لیے سارا معاملہ سحری سحر نظر آتا ہے

ساحر و اندر کلامش ساحری
این دو حرفِ لا الٰہ خود کافری

حالات سے پریشان ہو کر کائنات کو انتقام پر آمادہ کرتا ہے۔

پاش پاش از ضربتش لات و منات
انتقام از وے بگیر اے کائنات

اس کا خیال ہے کہ حقیقت میں غائب سے وابستگی خطا ہے جو چیز جسمِ محسوس سے اوجھل ہے وہ معدوم ہے۔

دیدہ بر غائب فرو بستن خطاست
آنچہ اندر دیدہ می ناید کجاست

اسلام نے ملک و نسب، فضل و شرفِ خاندانی کی پرستش پر پانی پھیر دیا۔ ایک ممتاز قریشی کے ہاتھوں قبائلی اور نسلی بت کی شکست اس کے لیے حیرت انگیز ہے۔

مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب
از قریش و منکر از فضلِ عرب

اسلام نے آقا و غلام، زنگ و ترک کا امتیاز مٹا دیا۔ مساوات کے خلاف عادت بھی اس کے احساسِ تکبر پر ایک کاری ضرب ہے۔

در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلامِ خویش بر یک خواں نشست

حضرتِ اقبالؒ کا جس قدر کلام نعت میں ہے وہ اس قدر شدید و وسیع اور کثیر ہے کہ ایک ہی صحبت میں سب کا سب پیش نہیں کیا جا سکتا۔ انشاء اللہ کسی اگلی صحبت میں اس کی تکمیل ہو سکے گی ؎

فروزاں ہے سینہ میں شمعِ نفس
مگر تابِ گفتار کہتی ہے بس

مترجمہ احمد اللہ خاں
ایم۔اے

تعلیماتِ اقبال

از مولانا محمد علی مرحوم

دسمبر ۱۹۱۵ء کا زمانہ تھا کہ ہمارے دوست درویش اور علم کے اعتبار سے (ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم اے۔ پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا کے نام سے موسوم ہیں) کے پاس سے یکے بعد دیگرے دو قیمتی جلدیں وصول ہوئیں۔ گو ان کی وصولی کا درمیانی وقفہ زیادہ نہ تھا، تاہم ایسی نادر اور پُر اثر تصانیف کا انتظار میرے لیے صبر آزما تھا۔

دیگر لاکھوں ہندی مسلمانوں کی طرح، خود واقف ہونے کے باوجود اقبال سے نا واقف تھے، میں بھی برسوں سے اقبال کو جانتا تھا اور کچھ عرصہ سے جب کبھی مجھے کسی کام پر لاہور جانا پڑتا تو میں ان کا مہمان ہوتا، اور دیکھتا کہ وہ وکالت صرف اسی حد تک کرتے کہ ان کے حقہ کا معمولی خرچ نکل سکے۔ باقی وقت وہ اپنے پسندیدہ ادبیات اور فلسفہ کے مطالعہ اور

زیادہ تر اس پر اخر شاعری میں صرف کرتے جس کے ذریعہ وہ ہندی مسلمانوں کے دلوں کو مسخر کر رہے تھے۔

جبکہ دوسروں کو اقبال کی فطانت و ذہانت سے آگاہی حاصل کیے برسوں گزر چکے تھے۔ میں نے اقبال کا ایک شعر بھی نہ پڑھا تھا البتہ میں اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہوں کہ جب یکبارگی اقبال کے کلام نے مجھے مسحور کیا تو میں نے ایک حد تک مافات کی تلافی کی اور یہ اس طرح کہ اردو رسالوں اور اخباروں میں ان کا جو کلام شائع ہوتا اس کو بار بار پڑھتا اور میرا اندازہ ہے کہ پڑھنے والے اقبال کا کلام پڑھ کر جو مسرت محسوس کرتے ہیں ان کی مسرت میں شریک ہوتا۔ میرے نزدیک بجز غالبؔ کے جو غالباً اردو زبان کا سب سے بڑا شاعر ہے اور جو خود میرؔ کی برتری کا معترف ہے ایسے اشعار اردو صحافت میں کبھی اس قدر زیادہ نہیں پیش کیے گئے جتنا کہ کلام میرؔ۔ لیکن اب کلام میرؔ اور بعد ازاں کے کالم اقبال کے اشعار سے مزین ہونے لگے جو غالباً غالب کے انتقال کے بعد پیدا ہوئے۔

بحیثیت شاعر اقبال بیسویں صدی کے ہند میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے علمبردار تھے اور اسلامی ہند اس پنجابی گوشہ نشین اور شرمیلے بیرسٹر سے زیادہ کسی اور کا ممنون نہیں۔ اردو داں دنیائے اسلام کا کوئی گھرانا ایسا نہیں جو اقبال سے ناواقف ہو اور ہر طبقہ میں ان کا قدر داں اور عاشق تھا۔ اگر کسی نے اقبال سے عقیدت رکھنے میں مجھ سے برابری کی بلکہ مجھ سے بازی لے گیا وہ میرے بھائی (شوکت علی) تھے جو اپنی تقاریر میں اس والہانہ وارفتگی کے ساتھ جو ان کو اقبال کے کلام سے تھی ان کے اشعار اس کثرت سے استعمال کرتے کہ میں جذبۂ رشک کو دبانے کی تمام کوششوں کے باوجود

ان کا مذاق اڑاتا کہ وہ اپنی بے جان فصاحت و بلاغت سے سامعین کے جوش و خروش کو بیدار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکتے اگر وہ اقبال کے اشعار اس کثرت سے استعمال نہ کرتے۔

لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ اس دفعہ اقبال نے اپنی مثنوی فارسی میں لکھی ہے جس کے لیے انہیں اور مجھے اس فارسی کی تحصیل کو تازہ کرنے کی ضرورت تھی جو ہم نے برسوں پیشتر اپنے لال داڑھی والے آغا صاحب سے رامپور کے مکتب میں کی تھی۔ انھوں نے زور و شور کے ساتھ اپنی ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ بہر حال ہم نے اقبال کی اسرار خودی پڑھنی شروع کی اور بتدریج ان کا غصہ فرو ہونے لگا کیونکہ ہم نے محسوس کیا کہ اقبال کی یہ مثنوی ان کے گزشتہ کلام سے کہیں زیادہ بلند پایہ ہے اور اس کے ذریعہ وہ دنیائے اسلام کے ایک بڑے حصہ تک اپنی آواز پہنچا سکتے ہیں جو اردو کے ذریعہ ممکن نہ تھا ان کے آتش فشانی اردو کلام کے مقابلہ میں ابتداءً ان کی مثنوی بے جان اور سرد معلوم ہوئی لیکن جونہی ابتدائی باب ختم ہوا جس میں انہوں نے اپنے فلسفہ کا موضوع پیش کیا ہے اور اپنے مشرقی مطالعہ کنندگان کے آگے پرانی اصطلاحات کے نئے معنوں کی وضاحت کی ہے اور جس کے بعد وہ بجائے پی' ایچ' ڈی کے شاعر کے روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ہم نے محسوس کیا کہ مرمر کی مورتیں میں بھی زندگی کا سیل آتشیں دوڑنے لگا ہے۔ کلام مجید کی ضخامت کے مقدمہ میں جب مجھے متعدد مرتبہ لاہور جانا پڑا تھا تو میں نے ان کی زبان سے ان کی مثنوی کے بعض حصے سنے تھے جبکہ وہ لکھی جا رہی تھی۔ لیکن جس طرح کہ قرآن مجید کے معاملہ میں ہوا تھا یہاں بھی میں نے سامنے کے دروازوں کو دیکھ کر پیچھے کے عظیم الشان صحن کا اندازہ لگا سکا تھا لیکن جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا بتدریج پورا خاکہ

میری نظروں کے سامنے آ گیا اور میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی جب میں نے دیکھا کہ یہ فلسفی شاعر اپنے انوکھے انداز میں اسلام کے انہی بنیادی حقائق کو پیش کر رہا ہے جن کا خود میں نے بہ تمام و کمال ادراک کیا تھا۔

یہاں میں یہ واضح کر دوں کہ اسلامی ادبیات میں یہ چیز عام طور پر بیان کی جاتی ہے کہ اسلام کے معنے خدا کو کائنات کا حاکمِ مطلق تسلیم کرنا اور اس کی مرضی کے آگے اپنی گردن جھکا دینا ہیں لیکن ہمارے حقیقت ایمان دین کی نظر میں یہ بات اتنی معمولی تھی کہ وہ اسے در خورِ اعتنا نہ سمجھتے تھے اور ہم اس کی کنہ سے بالکلیہ لاعلم ہونے کے باوجود یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ گویا پوری طرح واقف ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کی حقیقت ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی اور ضرورت تھی کہ نئی قوت اور پورے زور کے ساتھ اس حقیقت سے لوگوں کو واقف کرایا جائے۔ اس امر کی ضرورت تھی کہ مسلمان مقصدِ زندگی سے آگاہ ہو کر سچے مسلمانوں کی زندگی بسر کریں۔ پورے منظر کو تبدیل کرنے کی ضرورت تھی اور یہی حقیقت تھی جس کا میں نے اپنے طور پر ادراک کیا تھا اور اسی نقطۂ نظر کو لے کر اقبال پھر ایک دفعہ مسلمانوں کے ذہنوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ حکومتِ الٰہیہ قائم ہو سکے۔ پیش پا افتادہ افکار میں تبدیلی کی ضرورت کا اندازہ اس وقت مشکل نہیں ہوتا جبکہ دوسری جلد (رموزِ بیخودی) میں اقبال حلفاً یہ بیان کرتے ہیں کہ ان کا لفظ لفظ قرآنی تعلیمات پر مبنی ہے نہ کہ جرمنی فلسفہ پر ——— جیسا کہ علماء نے خیال کرنا شروع کیا تھا۔

اقبال کی دوسری مثنوی رموزِ بیخودی اس شاہراہ کو نشان زد کرتی ہے جس کی زمین ہموار کرنے کا کام ان کی پہلی مثنوی اسرارِ خودی نے کیا تھا۔

اور اب منزلِ مقصود کا پالینا ایک اندھے کے لئے بھی دشوار نہ تھا جبکہ
ایک متعین مقصد کے ذریعے راستہ صاف نہ کیا جائے۔ اقبال کے نقطۂ نظر سے
زندگی ایک صحرا ہے اور خود آگہی یعنی خودی کی حقیقت کو پالینا گویا زندگی
کے مقصد کو پالینا ہے۔ یہی وہ مشیتِ الٰہی ہے جس کے لئے حکومتِ الٰہی کا کائنات
پر ظہور ہوا۔ جب ایک دفعہ آدمی مقصدِ حیات اور کائنات کی مخلوقات میں
جاری و ساری مشیتِ الٰہی کو پالیتا ہے تو درمیانی تمام مزاحمتیں "تاراج" ہو جاتی
ہیں۔ حقیقی "آزاد خودی" کا ادراک اور افراد گویا غیر حقیقی "انا" کا نابود کرتا ہے
اور زندگی کی الجھنیں اپنی ناگزیر جنگ جوئی اسلام کے دیے ہوئے امنِ عامہ
کے دامن میں عافیت پاتی ہیں۔ اسلامی پیغام اور اس کے دستورِ اخلاق
کے اہم خدوخال کی تشریح کرتے ہوئے اقبال نے بھی قومیت کی مذمت
کی ہے جو انسانی ہمدردیوں کے حلقۂ اثر کو محدود کر دیتی ہے اور نوعِ انسانی
میں تفریق و نفرت کا باعث ہوتی ہے۔

غلام دستگیر رشید
ایم۔ اے

اقبال در حضورِ آدم

اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

اقبال نے اپنے ایسے آثار چھوڑے ہیں کہ ان کی شخصیت بڑی حد تک ان میں جھلکتی ہے اور محرومی کا گلہ کسی قدر رفع ہو جاتا ہے۔ اُن کی صحبت میں ادب، حکمت، مذہب اور تاریخ کی بڑی بڑی حقیقتیں لطیف اور موثر شخصی کیفیتیں بن کر نکلتی ہیں۔ آہستہ آہستہ صحبت آشنا کی آنکھیں کھلتی جاتی ہیں اور سر جھکتا جاتا ہے۔ اُن کا فلسفہ و کلام علم اور عشق کی دو آنکھوں کا ایک نور ہے۔

ایک دن حضرت اقبال اپنی کوٹھی میں بیٹھے تھے۔ ایک جرمن یا آسٹرین سیاح آیا اور قریب ہمہ تن گوش ہو بیٹھا۔ اقبالؒ کی خدمت میں اپنی ایک بیاض پیش کی جس میں ہر ملک و قوم کے بڑے بڑے لوگوں نے اپنے قلم سے کچھ نہ کچھ لکھا تھا۔ اس نے درخواست کی کہ ڈاکٹر صاحب بھی اس پر کچھ لکھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک ذرا سی سطر لکھ دی۔ پھر اس سیاح نے پوچھا "آپ کس چیز کی تعلیم دیتے ہیں؟"

اقبالؒ نے جواب میں فرمایا میرے آباء و اجداد برہمن تھے۔ انھوں نے اپنی عمریں اس سوچ میں گزار دیں کہ خدا کیا ہے؟ میں اپنی عمر اس سوچ میں گزار رہا ہوں کہ انسان کیا ہے"۔ یہ نکتہ فکرِ اقبالؒ کی کلید بھی ہے کہ۔

سوم بت آن خود پرستم
کہ از نورِ خودی بینم خدا را

انسانی تہذیب و تربیت کا نظام اقبالؒ نے پیش کیا ہے اس کی بنیاد ہی انسانیت کا احترام اور اس کی حفاظت ہے۔ اپنے وصال سے پہلے لاہور ریڈیو اسٹیشن سے انھوں نے نوروز کے موقع پر جو پیام نشر کیا تھا وہ ان کے اسی خیال کی ترجمانی کرتا ہے۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں:-

"دورِ حاضر کو علوم عقلیہ اور سائنس کی عدیم المثال ترقیات پر بہت بڑا فخر و ناز ہے اور یہ فخر و ناز بلاشبہ حق بجانب ہے .... لیکن ان تمام ترقیات کے باوجود ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، قومیت، فسطائیت خدا جانے اور کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں اور نقابوں کے نیچے دنیا بھر کے گوشوں میں قدرِ حریت اور شرفِ انسانیت کی وہ مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا .... یاد رکھو انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔ جب تک تمام دنیا کی تعلیمی طاقتیں اپنی توجہ کو محض احترامِ انسانیت کے درس پر مرکوز نہ کر دیں گی۔ یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی بنی رہے گی .... ان واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ قومی وحدت بھی ہرگز ثابت و قائم نہیں۔ وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے۔ جو نسل، زبان، رنگ و قوم سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی

اور اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو پاش پاش کر دیا جائے گا۔ اس وقت تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے "الخلق عیال اللہ" کا قائل نہ ہوگا۔ جب تک جغرافیائی وطن اور نسل و رنگ کا امتیاز نہ مٹ جائے گا انسان اس دنیا میں فوز و فلاح کی زندگی بسر نہ کر سکے گا۔ اور اخوت، حریت اور مساوات کے الفاظ کبھی شرمندۂ معنی نہ ہوں گے۔ آؤ اس نئے سال کو اس دعا پر ختم کریں کہ خدا ان بزرگ و برتر اربابِ حکومت و اقتدار کو انسان بنائے اور انہیں انسانیت کی حفاظت کرنا سکھائے۔"

اجتماعی زندگی میں انسانیت کی حفاظت، بقا اور ترقی کے حقائق اور اصول اقبال نے اپنی کتاب "رموزِ بیخودی" میں بیان کئے ہیں۔ اگر ہم "اسرارِ خودی" پر غور کریں اور رموزِ بیخودی سے قطع نظر کریں تو فکرِ اقبال کا صرف ایک ہی پہلو سامنے ہوگا۔ رموزِ بیخودی ہمیں اجتماعِ انسانی کی صحیح تنظیم کا راستہ بتاتی ہے بقول اقبال "جماعتی زندگی اور ملی حیات کا کمال یہ ہے کہ افرادِ قوم (یا مختلف اقوام و ملل) ایسے آئین کی پابندی سے جو مسلّم ہوں، اپنے ذاتی جذبات، میلانات اور مفادات کے حدود متعین کریں تاکہ انفرادی اعمال یا قومی مفادات کا تناقض اور اُن کی باہمی کشمکش مٹ کر اجتماعِ انسانی کے لئے ایک قلبِ مشترک پیدا ہو جائے۔ حقیقۃً وہ محدود خودی اصلی انسانی مقاصد کی تکمیل میں محو ہو جائے۔ اور انسان کی "اجتماعی انا" کو ظہور ہو سکے۔ رموزِ بیخودی میں تفصیلی بحث ہے کہ وہ آئینِ مسلّم کیا ہیں۔ اُن کا سرچشمہ کیا ہے۔ اُن کا عملی نمونہ کہاں پایا جاتا ہے

اپنے ایک بند پانچ خط میں اس حقیقت کی تشریح کے لئے ایک بلیغ مثال دی ہے کہ مسلمانوں کے انتہائی ضعف اور نقاہت کے زمانہ میں حبشہ کی

آزادی محفوظ رہی۔ لیکن مسولینی نے حبشہ کو محض جوع الارض کی تسکین کے لیے پامال کیا تھا۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ مسولینی کی خودی کسی آئین مسلم کی پابند نہ تھی اور دوسری صورت میں خودی قانونِ الٰہی اور اخلاق کی پابند تھی۔ انسانیت کے اجتماعی مفاد کی حفاظت اور اس کے احترام کی یہی راہ ہے ؎

اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

پروفیسر رشید احمد صدیقی

فلسفۂ بیخودی

ہر چیز ایک نظام کے ماتحت ہوتی ہے۔ ہماری زندگی فی الحقیقت علائق اور نسبتوں کی ایک نامتناہی زنجیر ہے۔ جزو و کل کا ربط ناگزیر ہے۔ وہ ہر چیز جسے ہم انسانی زندگی سے تعبیر کرتے ہیں تعینات مخصوصہ کا نام ہے اور تعین کا وجود تسلسل سے ہے۔ افراد کا جماعت سے تعلق ہوتا ہے "جزو" کی بحث ہو چکی۔ اب کل کے ساتھ اس کی نسبتوں پر نظر ڈالنی لازم آتی ہے۔ اقبال نے اس کا اعادہ ان الفاظ میں کیا ہے ؎

فرد و قوم آئینۂ یک دیگر اند
سلک و گوہر کہکشان و اختر اند

فرد می گیرد ز ملت احترام
ملت از افراد می یابد نظام

فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

فرد تنہا از مقاصد غافل است
قوتش آشفتگی را مائل است

ملت کا قیام اختلاط افراد پر ہے اور اس کی تعمیر و تکمیل نبوت سے ہوتی ہے۔ جماعت کا حقیقی مفہوم نفس نبوت کا ترجمان ہے ہر شے خواہ وہ افراد سے متعلق ہو یا جماعت سے جب تک کوئی زندہ عقیدہ یا قانون اسے مربوط یا مستحکم نہ کرے ارتباط کا کوئی حقیقی مفہوم پیدا نہیں ہوتا۔

تا خدا صاحبدلے پیدا کند
کو ز حرفے دفترے املا کند

ساز پردازے کہ از آوازۂ
خاک را بخشد حیات تازۂ

زندہ از یک دم دو صد پیکر کند
محفلے رنگیں ز یک ساغر کند

بند ہا از پا کشاید بندہ را
از خداوندان رہاند بندہ را

گویدش تو بندۂ دیگر نۂ
زین بتان بے زباں کمتر نۂ

تا سوئے یک مدعا اش می کشد
حلقۂ آئین بپایش می کشد

ایک اسلامی شاعر ہونے کی حیثیت سے اقبال کے نزدیک اس عالم کی حقیقی نجات بالخصوص اور دیگر معاشرت کے تمام شعبہ جات کی کامیابی کا مدار اسلامی اصول کی پابندی اور اس کے تحفظ سے وابستہ ہے۔ شاعری کا براہ راست

کام ہے کہ وہ جذبات کو متاثر کرے اور ایک مذہب پرست کا شیوہ مذہبی عقاید کی ترویج و تلقین ہے وہ بھی اس طور پر کہ وہ اپنے عقاید کو محض عقاید کی حیثیت سے تسلیم کرائے۔ ان نظریات کو ملحوظ رکھ کر اقبال کی شاعری پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت محسوس ہوتی ہے کہ وہ باوجود شاعر اور مذہب پرست ہونے کے انسانی ذہن و فکر کے میلانات طبعی کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے۔ جو ارکانِ اسلامی کی صداقت اور ہمہ گیری پر زور دیتے ہیں اس لیے نہیں کہ وہ خود مسلمان ہیں بلکہ محض اس بنا پر کہ انسانی ذہن و فکر کا اسلام سے انحراف کرنا ناممکنات سے ہے اور یہی وجہ ہے کہ اپنے شعر و شاعری میں الفاظ اور ترکیبیں تو مخصوص شاعرانہ رکھتے ہیں لیکن بحث و استدلال ایک فلسفی حکیم کی انداز سے کرتے ہیں۔ اسلام کے ارکان اساسی میں توحید، رسالت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کو مخصوص حیثیت حاصل ہے۔ آخر الذکر چار فرائض ایسے ہیں جو عمل سے متعلق ہیں اقبال نے ان کے فلسفہ پر خیالات ظاہر کیے ہیں لیکن پہلے دو حقیقتوں یعنی توحید اور رسالت پر رموز بیخودی میں نہایت شرح و بسط سے بحث کی ہے، توحید اور رسالت کا تعلق چونکہ معتقدات سے ہے اور یہیں سے دوسرے تجربات کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس لیے اقبال نے ان پر خصوصیت کے ساتھ بحث کی ہے کیونکہ توحید اور رسالت کو دیگر ارکان اسلامی سے وہی نسبت ہے جو بقیہ دفعات قانونی کو تمہید یا "پری ایمبل" سے ہوتی ہے فرماتے ہیں سے

اہلِ حق را رمز توحید از بر است
در آتی الرحمٰن عبداً مضمر است

دین ازو، حکمت ازو، آئین ازو
زور ازو، قوت ازو، تمکین ازو

اسود از توحید احمر می شود
خویش فاروقؓ و ابوذرؓ می شود

ملت از یک رنگیِ دلہاستی
روشن از جلوہ این سیناستی

قوم را اندیشہ ہا باید یکے
در ضمیرش مدعا باید یکے

جذبہ باید در سرشتِ او یکے
ہم عیارِ خوب و زشتِ او یکے

گر نباشد سوزِ حق در سازِ فکر
نیست ممکن این چنین اندازِ فکر

مدعاے ما مآلِ ما یکے ست
طرز و اندازِ خیالِ ما یکے ست

توحید ہی وہ حقیقت ہے جو انسان کو ان کمزوریات سے محفوظ و مصئون رکھتی ہے جن میں اسیر ہو کر وہ زندگی کو پرآشوب تصور کرنے لگتا ہے۔ مایوس، محزون یا خوف زدہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یا تو انسان کو اپنے اوپر اعتماد نہیں ہے یا پھر وہ کسی ایسے حکیم و قادر کا قائل نہیں ہے جو نہ کبھی غلطی کرتا ہے اور نہ کبھی ظلم کو روا رکھتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جائے گی کہ خود اعتمادی کا اصلی راز بھی اسی عقیدۂ توحید میں

مضمر ہے کہ ہم کو اپنے اوپر اس لئے نہیں اعتماد ہے کہ ہماری قوت و حکومت کے ذرائع و وسائل نامحدود ہیں بلکہ اس کا باعث صرف یہ ہے کہ جہاں سے ہم قوت و قدرت حاصل کرتے ہیں وہ ایک ایسی ہستی اور حقیقت ہے جو کبھی غلطی یا زیادتی نہیں کرتی۔ اس لئے جب تک ہم اس حقیقت یا ہستی کی پیروی کریں گے ناکامیاب نہیں رہ سکتے۔ اقبال نے اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے ؎

مرگ را سامان ز قطع آرزوست
زندگانی محکم از لاتقنطوا ست

اے کہ در زندان غم باشی اسیر
از نبی تعلیم لاتحزن بگیر

چون کلیمے سوئے فرعونے رود
قلب او از لاتخف محکم شود

بیم غیر اللہ عمل را دشمن است
کاروان زندگی را رہزن است

بیم چون بند است اندر پائے ما
ورنہ صد سیل است در دریائے ما

ہر شر پنہان کہ اندر قلب تست
اصل او بیم است اگر بینی درست

لابہ و مکاری و کین و دروغ
این ہمہ از خوف می گیرد فروغ

ہر کہ رمز مصطفے فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

اسلام سے پہلے انسانی ذہن و فکر کو وہ آزادی حاصل نہ تھی جسے آج ہم علم و تہذیب کا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں۔ انسان موجوداتِ فطرت کی پرستش کرتا تھا اس لیے وہ کبھی اس پر جری نہ ہو سکا کہ اُن کو اپنا تابع اور مسخر بنائے۔ چاند، سورج، برق و باراں، پہاڑ، دریا، غرض کہ اس قسم کی تمام چیزیں اس کے نزدیک معبود کی حیثیت رکھتی تھیں۔ پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ اُن کا کسی طور پر تجزیہ کرتا یا اُن پر قدرت حاصل کرنے کی جرأت کرتا۔ اس سے ترقی کر کے انسان نے انسان کی پرستش شروع کی۔ اس کی مختلف صورتیں تھیں کبھی اس نے اپنی ہی نوع کو مذہبی حیثیت سے قادرِ مطلق گردانا اور کبھی کسی جابر قیصر ان کے آگے جھکا۔ اس کا ایک نہایت دل نشیں خاکہ رموزِ بیخودی میں اقبال نے یوں پیش کیا ہے ؎

بود انساں در جہاں انساں پرست
ناکس و نابود مند و زیر دست

سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش
بندہا در دست و پا و گردنش

کاہن و پاپا و سلطان و امیر
بہرِ یک نخچیر صد نخچیر گیر

صاحبِ اورنگ و ہم پیرِ کنشت
باج بر کشتِ خرابِ او نوشت

در کلیسا اسقفِ رضواں فروش
بہرِ ایں صیدِ زبوں دامے بدوش

برکن گل از خیابانش بہر
خوشش تیغ نادہ با آتشش سپرد

از غلامی فطرت او دوں شدہ
نغمہ ہا اندر نے او خوں شدہ

ایک دوسرے مقام پر اس کا اعادہ یوں کیا ہے ؎

فکرِ انساں بت پرستے بت گرے
ہر زماں در جستجوے پیکرے

باز طرحِ آذری انداختہ است
تازہ تر پروردگارے ساختہ است

کاید از خوں ریختن اندر طرب
نام او رنگ است و ہم ملک و نسب

اگر غور کیا جائے تو اسلام نے سب سے بڑی نعمت جو دنیا کو عطا کی وہ یہ ہے کہ ہر انسان علم و عمل کے لئے آزاد ہے۔ اس طور پر بقول اقبال اسلام کو ایک وسیع عملی تحریک قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک حقیقت تھی جس کو اسلام سے قبل طرح طرح سے مستور رکھا گیا۔ اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے اس لیے اس نے اس حقیقت کو فطری ہی طور پر بے نقاب بھی کیا۔ اس نے محض ایک موقف نہیں پیش کیا بلکہ ساتھ ہی ساتھ نمونہ بھی دنیا کے سامنے لا کھڑا کیا اور وہ بھی اس سہل اور سادہ انداز سے کہ معمولی سے معمولی عقل و تمیز بھی اس سے پوری طور پر آشنا ہو سکی۔ اسلام کے خدا نے اسلام کو محض اپنے کلام و الہام سے اعلان نہیں کیا بلکہ اس کو جنابِ رسالتمآب کی ذات میں ثابت بھی کر دیا۔ رسالت آپ کے وجود و حیات سے نہ صرف

یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ خدا کیا ہے بلکہ انسان کو کیا کرنا ہے اور جو کچھ کرنا ہے وہ کر بھی سکتا ہے۔ تنظیرہ آں رسالت مآبؐ کی زندگی کو خدا سے وہی نسبت حاصل ہے جو انسانوں کو رسالتمآبؐ سے حاصل ہے۔ اس لیے جہاں تک علم و عمل کا دخل ہے رسالت مآبؐ کی زندگی ہم انسانوں کے لیے خدا کی ذات و صفات سے زیادہ قریب، زیادہ قابلِ تقلید اور زیادہ ممکن العمل ہے۔ ممکن ہے اسی عقیدہ کا اظہار اقبال نے ان الفاظ میں کیا ہو ؎

معنیٔ حرفم کنی تحقیق اگر
بنگری با دیدۂ صدیقؓ اگر

قوتِ قلب و جگر گردد نبیؐ
از خدا محبوب تر گردد نبیؐ

رسالت مآبؐ نے دنیا کے سامنے جو دستور العمل اپنے نمونۂ زندگی سے پیش کیا ہے اس پر غور کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "حریت" "مساوات" و "اخوتِ بنی نوعِ انسان" کی بنیاد اس کا نمونہ اور اس کو مقصود "رسالتِ محمدیہ" یعنی عالمِ انسان کی نجات ان ہی ہر سہ حقیقتوں کی تشکیل و تعمیم میں مضمر ہے۔ حریت نے ہر انسان کو انفرادی طور پر آزاد کیا، مساوات نے ان سب کو باعتبارِ فطرت ایک سطح پر لا کھڑا کیا اور پھر ان دونوں کو جس نے دنیا کے لیے باعثِ رحمت و عافیت بنا دیا وہ "اخوتِ بنی نوعِ انسان" ہے یعنی اسلام کے اصطلاحی اور محدود مفہوم سے قطع نظر کر لیا جائے تو اس کے تسلیم کرنے میں کسی شبہہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ ان صفات کے اعتبار سے اسلام زمان و مکان دونوں کی قید سے آزاد ہے۔ ممکن ہے یہی سبب ہو جس کی بنا پر

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسول ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفل ایام را
او رسل را ختم و ما اقوام را
خدمت ساقی گری با ما گذاشت
داد ما را آخریں جامے کہ داشت

اقبالؒ کے زبان پر آیا ہو۔

حریت مساوات اور اخوت کی بنا پر قومیت کا جغرافیائی مفہوم بالکل بے معنی ہو جاتا ہے "دینِ اسلام" کا رمز ملک گیری میں نہیں بلکہ "اخوتِ بنی نوعِ انسان" میں مضمر ہے۔ ترکوں کا جدید رویہ جس کی بنا پر انھوں نے جمہوریہ ترکی "وطنیتِ ترکیہ" پر قائم کیا ہے اس بنا پر صحیح نہیں ہے کہ انھوں نے ترک یا ترکی اور اسلام کو دو مختلف حیثیتیں دے دی ہیں۔ عزلِ خلافت سے انھوں نے اسلام کے مفہوم کو بھی مسخ کر دیا ہے۔ خلافت کا کام یہ نہ تھا کہ اسلام کے دینی اقتدار کو دنیوی طاقت سے برقرار رکھا جائے بلکہ اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ دنیوی اقتدار کو ان پابندیوں سے بے نیاز نہ ہونے دیا جائے۔ جن سے آزاد ہو کر حکومت اور اس کی نعمتیں محض ایک ہی قوم اور ایک ہی خطہ تک محدود نہیں رہ جاتیں بلکہ دوسری اقوام اور دوسرے ممالک کے لیے موجبِ آزار ہوتی ہیں۔ حکومتِ ترکی نے وطنیتِ ترکیہ کے قائم کرنے میں یوں غلطی کی ہے کہ اس نے نہ صرف اسلام کی جہانگیری اور اس کے فیضِ عام کو ترکی تک محدود کر دیا اور شاید یہ بھی تحقیق نہیں ہے۔ بلکہ ایک طور پر اس نے دوسرے اقوام کو بھی اسلام کی خوبیوں سے بے خبر رکھنے کا ارادہ کر لیا ہے

اسلام صرف مسلمانوں کے لیے نہیں آیا ہے بلکہ یہ دوسرے اقوام اور دوسرے ممالک کے لیے بھی ایک پیغام عمل و عافیت ہے۔ اسلام صرف اسلامیوں کے لیے نہیں بلکہ بنی نوع انسان کے لئے ایک عام تبلیغ عمل ہے جس کو کسی صورت میں محدود نہیں کرنا چاہئے۔ ملت اسلامیہ زمان و مکان دونوں قیود سے آزاد ہے اور یہی سبب ہے کہ اسلام میں نسل و ملک کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔ ؎

جوہر ما با مقامے بستہ نیست
بادۂ تندش بجامے بستہ نیست

ہندی و چینی سفال جام ماست
رومی و شامی گل اندام ماست

قلب ما از ہند و روم و شام نیست
مرز و بوم او بجز اسلام نیست

مسلم استی دل باقلیمے مبند
گم مشو اندر جہانِ چون و چند

می نگنجد مسلم اندر مرز و بوم
در دلِ او یاوہ گردد شام و روم

عقدۂ قومیت مسلم کشود
از وطن آقائے ما ہجرت نمود

لے مسلم استی بے نیاز از غیر شو
اہل عالم را سراپا خیر شو

حکمتش یک ملت گیتی نورد
بر اساس کلمہ تعمیر کرد

ہجرت آئین حیات مسلم است
این ز اسباب ثبات مسلم است

صورت ماہی بہ بحر آباد شو
یعنی از قید مقام آزاد شو

آن چنان قطع اخوت کردہ اند
بر وطن تعمیر ملت کردہ اند

تا وطن را شمع محفل ساختند
نوع انسان را قبائل ساختند

مردمی اندر جہان افسانہ شد
آدمی از آدمی بیگانہ شد

روح از تن رفت و ہفت اندام ماند
آدمیت گم شد و اقوام ماند

تا سیاست مسند مذہب گرفت
این شجر در گلشن مغرب گرفت

قصۂ دین مسیحائی فسرد
شعلۂ شمع کلیسائی فسرد

بادہ‌ہا خوردند و صہبا باقی ست
دورہا خون گشت و فردا باقی ست

در سخن یارست و صحبت قائم ست
خود درونگیر ست و تیغ من کم ست

فرد برمی‌خیزد از مشت گلے
قوم زاید از دل صاحبدلے

گرچہ ملت ہم بمیرد مثل فرد
از اجل فرمان پذیرد مثل فرد

امت مسلم ز آیات خداست
اصلش از ہنگامۂ قالوا بلیٰ ست

از اجل این قوم بے پرواستے
استوار از نحن نزّلنا ستے

سطوت مسلم بخاک و خون تپید
دید بغداد آنچہ روما ہم ندید

تو مگر از چرخ کج رفتار پرس
ناو ذوذنبی کہن بنیاد پرس

آتش تاتاریان گلزار کیست
شعلہ‌ہائے او گل دستار کیست

رومیان را گرم بازاری نماند ۱
آن جہانگیری جہانداری نماند ۲

شیشۂ ساسانیاں در خون نشست
رونق خمخانۂ یوناں شکست

مصر ہم در امتحاں ناکام ماند
استخوان او تہ اہرام ماند

در جہاں بانگ اذاں بود ست و ہست
ملت اسلامیاں بود ست و ہست

ملت کی بنیاد اختلاط افراد پر ہے لیکن خود ملت کی شیرازہ بندی کے لئے بھی کسی آئین یا دستور کا وجود لازمی ہے۔ ایک ایسی ملت کیلئے جو تمام عالم کے لیے ابد الآباد تک ایک زندہ حقیقت کا درجہ رکھتی ہو ضروری ہے کہ اس کا آئین بھی اتنا ہی ہمہ گیر اور لازوال ہو، جیسا کہ اس سے پہلے کہیں آچکا ہے۔ افراد اور ملت دونوں کسی نہ کسی حد تک فنا پذیر ہیں لیکن مقصد حقیقی ان اسالیب عمل سے بلند و پائندہ تر ہوتا ہے، جس کی طرف اقبال نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے ؎

نفس گل از نسترن باقی تر است
از گل و سرو و سمن باقی تر است

کان گہر پروردہ گوہر گرے
کم نہ گردد از شکست گوہرے

ملت اسلامیہ کا آئین قرآن مبین ہے۔ اقبال نے اس خیال کو یوں ادا کیا ہے ؎

نغمہ از ضبط صدا پیدا ستی
ضبط چوں رفت از صدا غوغا ستی

در گلوے او نفس موجِ ہوا ست
چوں ہوا پابندِ نے گردد نوا ست

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست؟
زیرِ گردوں سرِ تمکینِ تو چیست

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ او لا یزال است و قدیم

حرفِ او را ریب نے تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حاملِ او رحمۃ للعالمین

اندروشش کوہ بارش رشافت
سطوتِ او زہرۂ گردوں شگافت

بنگر آں سرمایۂ آمالِ ما
گنجد اندر سینۂ اطفالِ ما

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اسی سلسلے میں اقبال نے ایک نہایت نازک لیکن اتنا ہی معرکۃ الآرا مسئلہ بھی پیش کیا ہے جس پر اس زمانہ میں صبر و پامردی کے ساتھ غور کرنا اتنا ہی ناممکن معلوم ہوتا ہے جتنا یہ ضروری بھی ہے یعنی زمانۂ انحطاط میں تقلید اجتہاد سے بہتر ہے۔

آج بیرونی اثرات کے سیلاب اور مذہبی ناواقفیت (جس میں علم و

عمل دونوں کا نقصان ہے) نے ہر شخص کو اس پر جری کر دیا ہے کہ وہ اسلام کی تعلیم پر نظر ثانی کرے۔ کسی مسئلے پر مجتہدانہ انداز سے نظر ڈالنا قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ آج اجتہاد کے علم بردار کہے جاتے ہیں ان کے میلانات ذہنی یا استعداد علم و عمل کا تجزیہ کیا جائے تو حسب ذیل قوتیں بر سرِ کار نظر آئیں گی جن کے موجود ہوتے ہوئے یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ ان نام نہاد اجتہادیوں کا طرزِ عمل صحیح نہیں ہے:۔

(۱) عام طور پر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ موجودہ مغربی تہذیب ہر حال میں مفید اور قابلِ تقلید ہے۔ اس وقت زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو تہذیب یورپ کو اسلام سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں۔ بعض ایسے مسلمان مصنفین جو یورپین تہذیب اور خیالات سے باخبر کہے جا سکتے ہیں یا کہے جاتے ہیں، اپنے سامنے یہ حقیقت رکھ کر آگے بڑھتے ہیں کہ جو کچھ اس وقت یورپ میں تہذیب و تمدن کے اعتبار سے مفید اور بہتر خیال کیا جاتا ہے وہ اسلام کی تاریخ اور تہذیب کے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ یہ اصول غلط بھی ہے اور خطرناک بھی

(۲) اکثر ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ اسلام کے بعض اصول کو کسی طور پر کمزور یا قابلِ اصلاح سمجھتے ہیں وہ خود اپنے علم و عمل کے اعتبار سے جامع نہیں کہے جا سکتے۔ جب تک اسلام اور مغربی اصول دونوں کا صحیح اور مکمل تجزیہ نہ ہو اس وقت تک کسی قسم کی ترمیم یا تنسیخ پیش کرنا صحیح نہ ہوگا

(۳) یورپ کو اس وقت ایک حکمران کی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے اس کو وہ سب فطری سہولتیں حاصل ہیں جو اس کے تہذیب

وطنوں کو مقبول بنا سکتی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ جہاں خالص اسلامی شریعت نافذ ہے وہاں اسلامی اصول کا نفاذ کہاں تک مفید یا مکمل ہے۔ اس سلسلہ میں ہم کو افغانستان کی مثال سامنے رکھنی پڑے گی۔ لیکن اندیشہ ہے کہ بعض حضرات ترکی کی مثال پیش کرنا زیادہ اہم سمجھیں گے۔ اب تک ترکوں یا کمالیوں کا اس بارۂ خاص میں جو رویہ رہا ہے۔ اُسے ملحوظ رکھتے ہوئے بے تامل کہا جا سکتا ہے کہ ترکی سلطنت صحیح معنوں میں سلطنتِ اسلامیہ نہیں ہے بلکہ محض سلطنت یا "وطنیتِ ترکیہ" کی حیثیت رکھتی ہے۔ ترکی نے جو نیا ورق پلٹا ہے اس کا کچھ ہی سبب کیوں نہ ہو جن اسباب یا واقعات کی بنا پر اس نے اتنا زبردست انقلاب روا رکھا ہے وہ اسلام یا خلافت کی کوتاہیوں یا زیادتیوں کے سبب سے نہ تھا بلکہ اس کی اصل وجہ خلفائے عثمانیہ یا دولتِ عثمانیہ تھی۔

(۵) انحطاط کے زمانہ میں قوائے جسمانی و ذہنی دونوں پژمردہ ہو جاتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلاف کے کارنامے اپنے نظروں میں ناقابلِ رسائی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ انسانی فطرت دشوار پسندی اور اولوالعزمی سے فطری طور پر کنارہ کش رہنا چاہتی ہے۔ قوم اور افراد دونوں فاتح کی حیثیت حاصل کرنے کی بجائے فاتحین کی ہمرکابی و جنبوائی زیادہ پسند کرنے لگتے ہیں۔ اقبال نے اس حالت میں تقلید کو اجتہاد سے بہتر بتایا ہے ؎

عہدِ حاضر فتنہ ہا زیرِ سر است
طبعِ ناپروائے او آفت گر است

بزمِ اقوامِ کہن برہم ازو

شاخسارِ زندگی بے نم ازو

جلوہ اش ما را ز ما بیگانہ کرد
ساز ما را از نوا بیگانہ کرد

از دلِ ما آتشِ دیرینہ برد
نور و نارِ لا الٰہ از سینہ برد

راہِ آبا رو کہ این جمعیت است
معنیِ تقلید ضبطِ ملت است

اجتہاد اندر زمانِ انحطاط
قوم را برہم ہمی پیچد بساط

ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگان محفوظ تر

جس طرح ہر عمل کا کوئی خاص مقصد ہوتا ہے خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی اسی طور پر ملتِ اسلامیہ محمدی کا ایک نصب العین ہے اور وہ "حفظ و نشرِ توحید" ہے۔ افراد کو جو قوت جماعت کی شکل میں نمودار کرتی ہے وہ کسی مخصوص مقصد کی تبلیغ یا تشکیل ہے اگر ایسا نہ ہو تو افراد اور جماعت کبھی ایک مذہب سے وابستہ نہ ہو سکیں اس لیے "جمعیت" کا مدار کسی مخصوص نصب العین کی تعمیر و تعمیم پر ہے لیکن "حقیقی جمعیت" اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب نصب العین بھی ہر طور پر مکمل و مستحسن ہو۔ اس عالمِ حیات کا اصلی راز تبلیغِ توحید میں مضمر ہے اور چونکہ اسلام کو دینِ فطرت ہونے کا دعویٰ ہے اس لیے مقصد بھی اتنا ہی عالمگیر اور مقدس ہے۔

ہمچو جاں مقصود پنہاں در عمل
کیف و کم از وے پذیرد ہر عمل

گردش خونے کہ در رگہائے ماست
تیز از سعی حصول مدعاست

صد نیستاں کاشت تا یک نالہ رست
صد چمن خوں کرد تا یک لالہ رست

نالہ ہا در کشت جاں کاریدہ است
تا نوائے یک اذاں بالیدہ است

نقطۂ ادوار عالم لا الٰہ
انتہائے کار عالم لا الٰہ

زانکہ در تکبیر راز بود تست
حفظ و نشر لا الٰہ مقصود تست

جلوہ در تاریکی ایام کن
آنچہ بر تو کامل آمد عام کن

لرزم از شرم تو چوں روز شمار
پرسدت آں آبروئے روزگار

حرف حق از حضرت ما بردۂ
پس چرا با دیگراں نسپردۂ

حیات انسانی کے تمام افعال و مشاغل باعتبار تعینات ہمیشہ مختلف ہوتے رہتے ہیں اور یہ محض اس لیے کہ مزید سعی و کوشش کے لیے ایک نمونہ سامنے ہو اور یہ معلوم ہوتا رہے کہ ہر سعی و حرکت کس طور پر اور کہاں تک

بار آور ہونے اور جو کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے کیا وہ اس پایہ کی ہے کہ اس کے لیے مزید کوشش کی جائے یا اس کے قائم رکھنے میں مزید تگ و دو روا رکھی جائے۔ گویا ہر مزید کوشش ابتدائی کوشش کے لیے ایک مہمیز ہے۔ اس طور پر گویا زندگی کی یہ سعی پیہم ایک مقصد و مرکز کے لیے ہے۔ حیات ملیہ کیلئے ضروری تھا کہ کوئی "مرکز محسوس" ہو۔ ملت اسلامیہ کا مرکز "بیت الحرام" ہے" اقبال نے اس تفصیل و تخصیص کی طرف یوں اشارہ کیا ہے ؎

در گرہ چوں دانہ دارد برگ و بر
چشم بر خود وا کند گردد شجر

نخلے از آب و گل پیدا کند
دست و پا و چشم و دل پیدا کند

ہمچناں آئینِ میلادِ امم
زندگی بر مرکزے آید بہم

حلقہ را مرکز چو جاں در پیکر است
خطِ او در نقطۂ او مضمر است

قوم را ربط و نظام از مرکزے
روزگارش را دوام از مرکزے

راز دار و راز ما بیت الحرام
سوز ما ہم ساز ما بیت الحرام

دعوئ او را دلیل استیم ما
از براہینِ خلیل استیم ما

در جہاں ازاد جستند آزاد کرد
با حدودش تا قدم شیرازہ کرد

تو ز پیوند حریمے زندۂ
تا طوافِ او کنی پایندۂ

در جہاں جانِ امم جمعیت است
در نگر سرِّ حرم جمعیت است

عبرتے اے مسلمِ روشن ضمیر
از مآلِ امتِ موسیٰ بگیر

داد چوں آں قوم مرکز را ز دست
رشتۂ جمعیتِ ملت شکست

آج یورپ کی جو چیز ہم کو سب سے زیادہ قابلِ رشک معلوم ہوتی ہے وہ اس کے فرزندوں کی تسخیرِ قوائے نظامِ عالم ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک قوائے نظامِ عالم کو مسخر کرنے کا تعلق ہے یورپ کی ترقی ہر نوع مہتم بالشان ہے۔ لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس حقیقت سے آشنا ہیں یا آشنا ہونا پسند کرتے ہیں کہ جو ترقیاں علم و عمل کی آج نظر آ رہی ہیں ان کی آج سے بہت پہلے مسلمانوں نے یورپ میں ابتدا کی تھی۔ یورپ کو جو برکات مسلمانوں سے حاصل ہوئیں ان کے شمار کرانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ اس کا اعتراف خود اہلِ یورپ کر چکے ہیں۔ مسلمان اکثر اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ وہ عام عالمِ اسلام پر اس وقت جو انحطاط رونما ہوتے ہیں وہ اسلام کے اساسی تعلیمات کے سبب سے نہیں ہے بلکہ اس کا باعث مسلمان خود ہیں۔ مسلمانوں نے جب سے تعلیم کی

مذہب نے نہیں دی ہے کہ یہ سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، دریا، آبشار، برق و باد پرستش کے لیے نہیں ہیں بلکہ انسان کے تابع کیے گئے ہیں اور وہ اس کے ذہن و فکر اور قوتِ عمل کی مختلف وسیع جولانگاہیں ہیں۔ اسلام تو ایک شریعتِ عمل تھا، ہم نے اس کو یا تو متکلمین و معتزلہ کی ورزشِ دماغی سمجھ لیا یا پھر جاہل مولویوں یا واعظوں کا وسیلۂ رزق۔ قوائے عالم کی تسخیر تو جنگِ روم کی لطیف معنیوں یا تکفیر کے فتووں سے نہیں کی جا سکتی۔ اس کے لیے ضرورت تھی محنت اور قربانی کی جس سے ہم آج بھی بہت دور ہیں۔ ہم تو دوسروں کے ثمرۂ محنت سے مستفید ہونا ہی اپنا ایک بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں۔ ہماری بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم اسلام کی تعلیم کو محض "راہِ نجات" یا "بہشتی زیور" کی تعلیم سمجھنے لگے ہیں، حالانکہ قرآن پاک ایک زندہ جاوید پیغامِ عمل ہے جس سے منحرف رہ کر مسلمان ہی نہیں کوئی قوم دنیا میں زندہ یا کامیاب نہیں رہ سکتی۔ حیاتِ ملیہ اسلامیہ کا مقصد اسرارِ حیات کو اس طور پر پراگندہ نقاب کرنا ہے کہ دنیا میں امن و کامرانی کے امکانات وسیع ہوتے رہیں۔ اس لیے حیاتِ ملی کے لیے لازم ہے کہ اس کا مقصد ہی تسخیر قوائے نظامِ عالم ہو۔ اقبال نے اس کی تبلیغ یوں کی ہے:

اے کہ با نادیدہ پیماں بستۂ
ہمچو سیل از قیدِ ساحل رستۂ

چوں نہال از خاکِ ایں گلزار خیز
دل بغائب بند و از حاضر ستیز

ماسوا از بہرِ تسخیر است و بس
سینۂ او عرصۂ تیر است و بس

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد
عالمے از ذرہ تسخیر کرد

کوہ و صحرا، دشت و دریا، بحر و بر
تختۂ تعلیم اربابِ نظر

نائبِ حق در جہاں آدم شود
بر عناصر حکمِ او محکم شود

آنکہ بر اشیا کمند انداخت است
مرکب از برق و حرارت ساخت است

علمِ اسما اعتبارِ آدم است
حکمتِ اشیا حصارِ آدم است

افراد کے سلسلے میں خودی کی بحث انھیں صفحات پر کہیں آ چکی ہے اس لیے اس کا تذکرہ تحصیل حاصل ہوگا۔ جس طرح افراد کے لیے استحکام خودی ضروری ہے، اسی طور پر جماعت کے لیے بھی "احساسِ خودی" لازمی ہے۔ جہاں تک ان اصول و عقائد کا تعلق ہے جن کے حفظ، تعمیر و تشکیل کا وسیلہ ملت اسلامیہ ہے بحث اس سے پہلے آ چکی ہے کہ ہماری حیات کا مقصد اور اس کا دارومدار لا الٰہ پر ہے لیکن ان کو جو نسبت رسول سے حاصل ہے وہ کئی حیثیت سے اہم ہے۔

خدا نے بعثت نبوی میں سب سے بڑا راز یہ رکھا ہے کہ وہ جو کچھ ہم بندوں سے کرانا چاہتا ہے اس کا ہم بندوں ہی میں سے نمونہ بھی پیش کر دیتا ہے تاکہ ہم اس کو اپنے لیے محض ایک آسمانی کرشمہ نہ سمجھیں جو بندوں کی فہم و ادراک یا ان کے بس عمل سے بالا ہو۔ بلکہ ایک ممکن العمل

حقیقت تصور کریں۔ ٹھیک اسی طور پر ملت کی ترقی و بقا کیلئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم محض عقائد مجردہ کی علم برداری کرتے رہیں بلکہ ان روایات کا احترام کریں اور اس کو برقرار رکھیں جو ہمارے برگزیدہ اسلاف نے اپنے عمل سے ہمارے سامنے پیش کیے ہیں۔ اقبال نے اس کی تفصیل و توضیح ایک نوزائیدہ بچے سے کی ہے جو ابتداً ہر شے سے نا آشنا ہوتا ہے اور جس کا

بستہ با امروز او فردا نیست
حلقہ ہائے روز و شب در پاش نیست

چشم ہستی را مثال مردم است
غیر را بینندہ و از خود گم است

رفتہ رفتہ:-

صد گرہ از رشتۂ خود وا کند
تا سرِ تارِ خودی پیدا کند

گرم چون افتد بکارِ روزگار
این شعور تازہ گردد پائدار

نقشہا بردارد و اندازد او
سرگزشت خویش را می سازد او

اسی طور پر:-

قوم روشن از سواد سرگزشت
خود شناس آمد ز یادِ سرگزشت

سرگزشت او گر از یادش رود

باز اندر نیستی گم می شود

چشم پُرکارے کہ بیند رفتہ را
پیش تو باز آفریند رفتہ را

ضبط کن تاریخ را پایندہ شو
از نفس ہائے رمیدہ زندہ شو

سر زند از ماضیِ تو حالِ تو
خیزد از حالِ تو استقبالِ تو

مشکن ار خواہی حیاتِ لازوال
رشتۂ ماضی ز استقبال و حال

موجِ ادراکِ تسلسل زندگی ست
مے کشاں را شورِ قلقل زندگی ست

موجودہ زمانہ میں ہر حقیقت کی سند جواز یا عدم جواز یورپ سے حاصل کی جاتی ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یورپ کے اصول یا اس کے فیصلے نقائص یا غلطیوں سے مبرا ہوتے ہیں بلکہ آج وہ فاتح کی حیثیت رکھتا ہے اور اپنے حواریین کو نشانہ اور مخالفین کو سرنگوں کرنے کے قابل ہے۔ ہم تو یہ نہیں دیکھتے کہ ہم میں کیا خوبیاں ہیں بلکہ یورپ کے بعض صریح نقائص کو بھی چاہتے ہیں کسی طور پر مستحسن ثابت کر سکیں قطع نظر دیگر مسائل کے جن کو معرض بحث میں لانا طوالت سے خالی نہیں ہے۔ ایک مسئلہ خواتین کی تعلیم حقوق اور آزادی کا ہے۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ یورپ نے عورتوں کو کیا سمجھ یا بنا رکھا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کا جو درجہ مقرر کیا ہے وہ ہماری نظروں میں کیا وقعت رکھتا ہے۔ تعداد ازدواج

پردہ اور اس قسم کی اور چیزیں ہم روشن خیالوں کے لیے نہایت ہیچ فرما ہیں اور مغرب کے لیے جب "حلف وفاداری" اٹھاتے ہیں تو سب سے پہلے ہماری نظر عورت ہی پر پڑتی ہے اس کے بعد کوئی تعجب نہیں کہ اگر مذہب بھی زد میں آجائے۔ نام نہاد روشن خیال طبقے کے کارناموں پر نظر ڈالی جائے یا ان کی میلانات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ ان میں سے ہر ایک کی نظر صرف دو نقائص پر پڑتی ہے، ایک مذہب دوسری عورت۔ لیکن لطف، عبرت یا تعجب یہ ہے کہ یہی دو چیزیں ہیں جو مشرق میں بالخصوص اسلام کے امتیازاتِ خصوصی ہیں، اسلام نے عورت (بالفاظ دیگر امومت) کو کیا درجہ دیا ہے۔ اقبال کے حسب ذیل خیالات سے ظاہر ہوگا ؎

پوشش عریانی مرداں زن است
حسن دل جو عشق را پیراہن است

آنکہ نازد بر وجودش کائنات
ذکر او فرمود با طیب و صلوٰت

ملت از تکریم ارحام است و بس
ورنہ کار زندگی خام است و بس

بردمد ایں لالہ زار ممکنات
از خیابان ریاض امہات

حافظ رمز اخوت مادراں
قوت قرآن و ملت مادراں

اقبال نے نساء اسلام کے لیے سیدۃ النساء کو "اسوۂ کاملہ" قرار دیا ہے ؎

نور چشم رحمۃ للعالمین
آن امام اولین و آخرین

بانوی آن تاجدار ہل اتیٰ
مرتضیٰ مشکل کشا شیر خدا

مادر آن مرکز پرکار عشق
مادر آن کاروان سالار عشق

مزرع تسلیم را حاصل بتول
مادران را اسوۂ کامل بتول

آن ادب پروردۂ صبر و رضا
آسیا گردان و لب قرآن سرا

نظم ہی کے اس حصے کو اقبال نے انتہائے جوش عقیدت سے لکھا ہے جس کے ایک ایک حرف سے والہانہ شیفتگی کا اظہار ہوتا ہے موجودہ زمانہ میں تہذیب و شائستگی کے نام سے اس پیکر ناموس و عفت کے ساتھ جیسا کچھ سلوک روا رکھا جا رہا ہے اقبال نے اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

اے ردایت پردۂ ناموس ما
تاب تو سرمایۂ فانوس ما

اے امین نعمت آئین حق
در نفسہائے تو سوز دین حق

دور حاضر تر فروش و پرفن است
کاروانش نقد دین را رہزن است

گرد وزبان ناشناسی در رگ او
همچنان زنجیری پیچاک او

چشم او بیباک و نا پروا سے
پنجۂ مژگان او گیرا سے

ہوشیار از دست برد روزگار
گیر شہر زندان خود را در کنار

این چمن زادان کہ پر بکشادہ اند
ز آشیان خویش دور افتادہ اند

فطرت تو جذبہ ہا دارد بلند
چشم ہوش از اسوۂ زہرا مبند

تا حسینے شاخ تو بار آورد
موسم پیشیں بہ گلزار آورد

خاتمۂ مثنوی پر اقبال نے سورۂ اخلاص (قل هو الله) کی تفسیر دی ہے اور اسے "خلاصۂ مطالب مثنوی" قرار دیا ہے۔ "هو الله احد" کا پیغام حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے زبان مبارک سے یوں دیا ہے ؎

آں کہ نام تو مسلماں کردہ است
از دوئی سوئے یکے آوردہ است

خویشتن را ترک و افغاں خواندۂ
وائے بر تو آنچہ بودی ماندۂ

صد ملل از ملتے انگیختی

بر حصارِ خویش شبخونے بزن

یک شود توحید را مشہود کن
غائبش را از عمل موجود کن

اسی طور پر دیگر ابیات عزیزی کی زبانی کی ہے ؎

گر به الله الصمد دل بسته‌ای
از حد اسباب بیرون جسته‌ای

بندۂ حق بندۂ اسباب نیست
زندگانی گردش دولاب نیست

راہ دشوار است سامان کم بگیر
در جہان آزاد زی آزاد میر

خود بخود گردد در میخانہ باز
بر تہی پیمانگانِ بے نیاز

فارغ از اب و ام و اعمام باش
ہمچو سلمان زادۂ اسلام باش

گر نسب را جزوِ ملت کردۂ
رخنہ در کارِ اخوت کردۂ

رشتۂ ما یک تولایش بس است
چشم ما را کیفِ صہبایش بس است

ہر کہ پا در بندِ اقلیم و جد است
بے خبر از لم یلد لم یولد است

رشتۂ با لم یکن، باید قوی
تا تو در اقوام بے ہمتا شوی

آں کہ ذاتش واحد است و لاشریک
بندہ اش ہم در نسازد با شریک

مومن بالائے ہر بالا ترے
غیرت او برنتابد ہمسرے

خوار از مہجوری قرآں شدی
شکوہ سنج گردش دوراں شدی

آخر میں اقبال نے "رحمۃ للعالمین" کے حضور میں "عرض حال" کیا ہے ۔

اے ظہور تو شباب زندگی
جلوہ ات تعبیر خواب زندگی

در جہاں شمع حیات افروختی
بندگاں را خواجگی آموختی

مسلم از سر نبی بیگانہ شد
باز ایں بیت الحرم بتخانہ شد

از منات و لات و عزی و ہبل
ہر یکے دارد بتے اندر بغل

اے کہ از احسان تو ناکس کس است
یک دعایت مزد گفتارم بس است

عرض کن پیش خدائے عزوجل
عشق من گردد ہم آغوش عمل

ہست شان رحمتت گیتی نواز
آرزو دارم کہ میرم در حجاز

تا بیاساید دل بے تاب من
بستگی پیدا کند سیماب من

با فلک گویم کہ آرامم نگر
دیدہ آغاز و انجامم نگر

خانصاحب محمد مشتاق علیخاں

نظم اقبال پر اک اجمالی تنقید

اقبال کی نظم وہ شاعری ہے۔ نہ بعینہٗ بالفظ ساحری جس کا زیر و بم ایک ہنگامی تلاطم کے سوا کچھ بھی نہیں۔ بلکہ اقوام عالم کے لیے ایک پیام زندگی ہے جسے بانگ سروش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے "شیخ اور شاعر" کے مکالمہ میں اقبال خود کہتا ہے:-

کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری
ہاں سنا دے محفل ملت کو پیغام سروش

اقبال کی شاعری کو تین حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور مشق سخن کا زمانہ ہے جس میں رنگا رنگ دلآویزیاں موجود ہیں۔ مگر یہاں بھی زندگی اور زندہ دلی کا عنصر غالب اور خودی و خودداری کا رنگ نمایاں ہے۔ لیکن جس چیز نے اقبال کو بین الاقوامی شہرت بخشی۔ وہ اسکی

فارسی مثنوی ہے۔ جس میں وہ ایک ہادیِ برحق اور رہبرِ کامل کی صورت میں جلوہ گر ہوا ہے۔

ابتدا میں ایک ہی مثنوی مدِنظر تھی۔ جس کے متعلق ۱۹۲۰ء میں علامہ مرحوم نے خود فرمایا تھا۔ کہ اس کی تکمیل کے بعد میں یہ سمجھوں گا۔ کہ میرا مقصدِ زندگی ختم ہو چکا۔ مگر کارفرمائے قضا و قدر کو اقبال سے بہت کام لینا منظور تھا۔ اس لئے بجائے ایک کے دو مثنویاں عالمِ وجود میں آگئیں اور "اسرارِ خودی" و "رموزِ بیخودی" کے بعد ہی "پیامِ مشرق" بھی طلوع ہوا۔ علاوہ ازیں اور بھی کئی کتابیں عالمِ وجود میں آئیں۔ جو ایک دوسری سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔

"اسرارِ خودی" اور "رموزِ بیخودی" کا اقبال ایک پختہ کار شاعر، نبض شناس حکیم اور رہبرِ کامل کے لباس میں جلوہ نما ہوا ہے۔ اسے اس کی شاعری کا دوسرا دور تصور کرنا چاہئے۔ لیکن "پیامِ مشرق" سے تیسرے دور کا آغاز ہوتا ہے جس میں وہ تمام ممالکِ مشرقی کی نمائندگی کرتا ہے۔ اور ازاں بعد منازلِ ارتقا طے کر کے آخر اس مقامِ محمود پہ پہنچ جاتا ہے۔ جہاں سے تمام اجزائے کائنات ایک کل کی صورت میں نظر آتے ہیں۔

"پیامِ مشرق" کی اشاعت پر پروفیسر آرنلڈ کا ایک ناقدانہ مضمون کسی انگریزی اخبار میں میری نظر سے گزرا تھا۔ جس میں "پیامِ مشرق" پر ایک عالمانہ تنقید کی گئی تھی۔ اور بعض اشعار کو انگریزی کا جامہ پہنایا گیا تھا۔ اس وقت یہ شعر مجھے بہت پسند آیا تھا ؂

اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں

خواب را مرگِ سبک دان، مرگ را خوابِ گراں

یعنی خواب کیا ہے۔ ایک ہلکی سی موت! اور مرگ کیا ہے۔ ایک گہرا خواب!!

اس کے علاوہ پروفیسر صاحب نے ان دو شعروں کو بھی اپنی زبان میں نظم کیا تھا۔

بیا را بزم بر ساحل کہ آنجا
نوائے زندگانی نرم خیز است

بدریا غلط و با موجش در آویز
حیات جاوداں اندر ستیز است

ان اشعار کی شانِ نزول یہ ہے۔ کہ ۲۱-۱۹۲۰ء میں جبکہ تحریک خلافت اور کانگریس اپنے شباب پر تھی کلکتے کے ایک انگریزی اخبار "جان بل" میں ایک کارٹون شائع ہوا۔ جس میں ایک حسین عورت کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے "بھارت ماتا" کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ اس کے آگے دوسری تصویر تھی جس پر "مسٹر گاندھی" لکھا تھا۔ یہ عورت آنکھیں بند کئے گاندھی جی کے پیچھے تھی۔ اور گاندھی کے آگے سمندر اور چٹان تھی۔ تصویر پیش کی گئی تھی کہ بھارت ماتا اندھا دھند جاتا گاندھی جی کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ کہ یا تو وہ سمندر میں غرق ہو جائے یا چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے۔

اخبار "زمیندار" کے ایک رکن ادارہ نے یہ تصویر علامہ مرحوم کو دکھائی اسے دیکھ کر آپ نے مذکورہ بالا دو شعر موزوں کئے۔ اور فرمایا کہ اس تصویر کے ساتھ انھیں "زمیندار" میں شائع کر دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ارباب ذوق سمجھ سکتے ہیں کہ مضمون کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ مگر اس وقت ہم

سمجھتے تھے کہ ان شعروں میں صرف ایک ہنگامی کیفیت ہے۔ لیکن جب پروفیسر ارشد کی نظر انتخاب نے انھیں اپنی تنقید کے لیے منتخب کیا۔ تو مجھے اس "ہر دم تازہ" کلام کی اہمیت محسوس ہوئی۔ اور آج بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ویسا ہی محرک و پرسوز ہے۔

اقبال کی تازہ ترین مطبوعات "بال جبریل" اور "ضرب کلیم" ہیں جو تیسرے دور کی پختگی کا پتہ دیتی ہیں۔ جس کی ابتدا "پیام مشرق" سے ہوئی۔ اب اقبال شاعری یا پیغمبری نہیں بلکہ تیر اندازی کرتا ہے۔ اور جو کچھ کہتا ہے۔ بالکل اسی طرح کہہ جاتا ہے جس طرح کہ وہ خود محسوس کرتا ہے گویا ایک واردات قلب ہے۔ اور قال نہیں بلکہ حال ہے۔ یا یوں کہیے کہ زبان و قلب کا وصل ہو چکا ہے۔ اس لیے جو بات نکلتی ہے۔ وہ جذبات کو جھنجھوڑنے اور روح کو گرمانے والی ہے۔ جس میں کوئی تمہید ہے نہ تکلف و تصنع۔ سیدھی بات سیدھے تیر کی طرح دل میں اتر جاتی ہے۔ اور اب اس کا روئے سخن تمام دنیا اور کل بنی نوع انسان کی طرف ہے۔

"بال جبریل" اور "ضرب کلیم" میں اقبال نے زندگی اور لوازم زندگی، رازِ حیات اور فلسفۂ مرگ کے مسائل حل کیے ہیں، اقوام عالم سے خطاب کیا ہے، نوجوانوں کو درس زندگی دیا ہے۔ طالب علم اور معلم دونوں کے لیے مشعل ہدایت تیار کی ہے، درویشی و قلندری، فقر و سلطنت اور سرمایہ داری و مزدوری کی کیفیت کو بے نقاب کیا ہے۔ جمہوریت کی عقدہ کشائی کی ہے۔ اور معرکۂ عشق و عقل سے ذہن شعور کو جگمگ کیا ہے۔ غرض کوئی شے نہیں جو یہاں حاضر نہ ہو۔

طالب علموں اور نوجوانوں کے لیے اقبال کی دعا ہے ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

ایک جگہ نوجوانوں کی رگِ ہمت و تدبیر کو یہ کہہ کر جھنجوڑا ہے ؎

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

یعنی اگر نوجوان آزادیٔ فکر و ضمیر سے بہرہ مند ہو جائیں تو نظر بہت اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ آسمانوں کو اپنی زمین تصور کرتے ہیں۔

موجودہ مدارس و مکاتب کے خود فراموش اثرات کا رونا ان الفاظ میں رویا ہے ؎

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسوں میں
نہ ادائے کافرانہ نہ تراشِ آزرانہ

یعنی اس میں تو کوئی شک نہیں کہ یہاں خدا پرستی کی بجائے بت پرستی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مگر رونا اس بات کا ہے کہ بتوں کی تراش و آذری بھی نہیں۔ بلکہ صرف حکام پرستی اور خود فراموشی کے بت گھڑے جاتے ہیں۔ جو نوجوانوں کو گھر و گھاٹ دونوں سے کھو دیتے ہیں۔

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے ؎

شکایت ہے مجھے یا رب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

۱؎ خداوندانِ مکتب یعنی مدرسین، معلم، پروفیسر وغیرہ ۱۲

نسخہ بھی شامل ہیں۔ اقبال کو ان سب سے یہی شکایت ہے کہ اولادِ آدم کو مفتوح و محکوم بنا دینے کی تعلیم دیتے ہیں۔ حالانکہ انسان کے بچے تمام عالم کو مسخر کرنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ بھلا یہ کیا انصاف و دیانت ہے کہ شاہین و عقاب کے بچوں کو زمین پر رینگنا سکھایا جائے اور انسان کے بچوں کو ہر باطل قوت کے آگے سر جھکانے کی تعلیم دی جائے

پھر کہتا ہے۔ بلکہ تنبیہ کرتا ہے ؎

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

یعنی وہ بچہ شاہین جو گدھوں میں پرورش پاکر بڑا ہوا ہو۔ اُسے شاہبازی کے طریقوں سے کیا واقفیت ہو سکتی ہے۔ پس یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ جن نوجوانوں نے مدرسہ میں غلامی اور محکومی پر قناعت کرنے کی تعلیم پائی ہے اُن سے جہانبانی اور کارفرمائی کی توقع کی جائے۔

مسلم ہندی یا بالفاظ صحیح تر قوم مغل کے لیے اقبال کی تنبیہ یہ ہے ؎

نہ فقر کے لیے موزوں نہ سلطنت کے لیے
وہ قوم جس نے گنوایا ہو تاجِ تیموری

یہ فطرتِ انسانی ہے کہ اگر کسی کی حقیر سے حقیر شے بھی کوئی بزورِ قوت لینا چاہے۔ تو وہ اس کی حفاظت میں اپنی جان لڑا دیتا ہے۔ بلکہ پہلے سے تدابیر تحفظ کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ اس کی حفاظت و نگہداشت ہی نہ کر سکے تو اس پر قابض و متصرف رہنے کا اہل نہیں۔ اور نا اہل شخص یا افرادِ قوم ہرگز درخورِ اعتبار نہیں۔ اس لیے جو قوم تاج و تختِ تیموری جیسی بیش بہا دولت کی حفاظت نہیں کر سکی۔ اس کا کوئی دعویٰ صحیح نہیں ہو سکتا۔ پس اگر

یہ قوم یا کوئی فرد قوم امارت کا دعویٰ کرے تو اسے بھی تسلیم نہ کرو۔ اور فقر کی دعوے دار ہو تو اسے بھی جھٹلا دو۔ کیونکہ درویشی کی اہل بھی وہی قوم ہو سکتی ہے جو سلطنت کی اہل ہو۔

"خواجگی" کے عنوان سے اقبال نے چند نہایت بلیغ شعر قلمبند کئے ہیں ؎

دورِ حاضر ہے حقیقت میں وہی عہدِ قدیم
اہلِ سجادہ ہیں یا اہلِ سیاست ہیں امام
اس میں پیری کی کرامت ہے نہ میری کا ہے زور
سینکڑوں صدیوں سے خوگر ہیں غلامی کے عوام
خواجگی میں کوئی مشکل نہیں رہتی باقی
پختہ ہو جاتے ہیں جب خوئے غلامی میں غلام

یعنی دورِ حاضر اور عہدِ قدیم میں کوئی فرق نہیں۔ کیونکہ اب بھی چند مذہبی اجارہ دار اور چند سیاسی ٹھیکیدار تمام دنیا پر مسلط ہیں۔ اور انسانی ہمت و تدبیر کو نشوونما سے روکے ہوئے ہیں۔ مگر اس میں سیاست کے دعوے داروں یا خرقہ پوشوں کی قابلیت کو مطلق دخل نہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بندگانِ خدا کا اکثر غلامی قبول کرنا فطرتِ ثانیہ بن گئی ہے۔ اس لیے پیروں کو مرید اور صاحب اقتدار لوگوں کو فرماں بردار بندے خود بخود مل جاتے ہیں۔ اور کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ یہ اندر سے ٹھوس ہیں یا کھوکھلے۔ یعنی جس طرح زمانۂ قدیم میں خود ساختہ معبودوں اور مفروضہ طاقتوں کی پرستش ہوتی تھی۔ اسی طرح اب کا ہر ذہن مرئی پرستش کی طرف رجحان ہے۔ گویا عوام الناس بلکہ خواص تک کی خوئے غلامی اتنی پختہ ہو گئی ہے کہ اب اس میں نہ پیری کی کرامت کو دخل ہے

تدبیر کی سیاست دانی کو۔ بلکہ لوگ ازخود ان کی طرف جھکے چلے آتے ہیں۔
پس زمانۂ جاہلیت اور زمانۂ حال میں کوئی فرق باقی نہیں رہا

"ہنرورانِ ہند" کے عنوان سے چار شعر اس طرح لکھے ہیں۔

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل اُن کا
اُن کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار

موت کی نقش گری اُن کے صنم خانوں میں
زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار

چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

ایک ذی فہم علومِ مشرقی و مغربی اب سے پندرہ بیس سال پیشتر مجھ سے فرمانے لگے۔ کہ جب شکسپیر سے لوگوں نے کہا کہ تم یاس انگیز افسانوں پر اپنا زورِ طبیعت کیوں نہیں دکھاتے تو اس نے جواب دیا کہ میں اس طرزِ تحریر سے اس لئے گریز کرتا ہوں کہ اسے انگریز سٹیج پر نبھا نہیں سکتے۔ شکسپیر کا یہ قول دہرانے کے بعد وہ صاحب کہنے لگے کہ اگر یاس انگیز افسانوں کا سٹیج پر ادا کرنا دشوار ہے تو ان کا لکھنا دشوار تر ہے پھر کیا بد مذاقی ہے کہ ہندوستانی افسانہ نویس بد انجام افسانے ہی لکھتا ہے میں نے جواب دیا کہ شکسپیر اور انگلستان کے متعلق تو یہ قول درست ہو سکتا ہے لیکن اگر ہندوستانی افسانہ نگار نیک انجام افسانے لکھیں تو وہ اس حد تک بھی کامیاب نہیں

ہو سکتے۔ جس حد تک کہ بد انجام افسانوں میں کامیاب ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہر ہندوستانی کی زندگی بجائے خود ایک داستانِ درد ہے۔ اور وہ اپنے حسبِ حال ہی بہتر لکھ سکتا ہے۔ دوسرے غلامی اور محکومی نے بقول اقبال اُسے زن مزاج بنا رکھا ہے۔

اقبال کا یہ شکوہ بالکل بجا ہے کہ ہندوستانی مفکروں، شاعروں، مصوروں اور سیاست دانوں تک کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ اور سب کے سب تابوتِ بردوش ہی نظر آتے ہیں۔

"نوبل پرائز" حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر ٹیگور جاپان بھی گئے تھے وہاں آپ ایک مجمع میں اپنی ویدانت بیان کر رہے تھے۔ تو اس وقت ایک جاپانی نے کہا کہ "ٹیگور تمہارا فلسفہ ایک مفتوح قوم کا فلسفہ ہے۔ جسے سننے کے لیے ہم ہرگز تیار نہیں"

اقبال اس محبوبیت سے نہ صرف ہر ہندوستانی کو بلکہ ہر انسان کو بچانا چاہتا ہے۔ اور فکرِ انسانی کو عقابی پرواز میں دیکھنا چاہتا ہے۔

غلامی اور محکومی سے بچنے کے لیے اقبال یہ نسخہ تجویز کرتا ہے:۔

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں، غلامی میں

زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا

انسان کی بیشتر مصیبتیں اور تمام ذرگزیدگیاں غرض پرستی کے تحت میں آتی ہیں۔ انسان کیوں ادنیٰ اور فانی طاقتوں کے آگے جھکتا ہے؟ اس لیے کہ اس کی غرض مندیاں اُسے مجبور کرتی ہیں۔ ایک انسان کیوں دوسرے انسان سے ڈرتا ہے؟ اس لیے کہ اس کی طمعِ نفسانی قوتِ مردانگی

کو سلب کر دیتی ہے ۔

آنچہ شیراں را کند روبہ مزاج
احتیاج است احتیاج است احتیاج

اگر انسان حیز خواہشات نفسانی کو ترک کر دے ، تو کسی دنیاوی طاقت سے مرعوب نہیں ہو سکتا ۔ اور پھر اُسے نہ ڈرنے کی نوبت آئے ڈرانے کی ضرورت باقی رہے ۔ اور جب اس کی تنگ نظری میں بے خوفی کا بھی اضافہ ہو جائے تو اس کا محکوم و مجبور رہنا غیر ممکن ہے ۔ پس اپنے دل کو پاک رکھو ۔ اور لذت و شہوات کے غلام نہ ہو ۔ پھر کوئی دنیاوی طاقت تمہیں غلام نہیں بنا سکتی

خدائی اور بندگی کا موازنہ اس طرح کیا ہے ۔

خدائی اہتمام خشک و تر ہے
خداوندا خدائی دردِ سر ہے
ولیکن بندگی ، استغفر اللہ
یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

کسی کام کی ذمہ داری اگر احساس فرض کے ساتھ لی جائے ، تو وہ ایک بڑی مصیبت اور دردِ سری ہے ، اور جتنی بڑی ذمہ داری ہوگی اتنی ہی وبال جان ہوگی ۔ اس لیے سب سے بڑی دردِ سری تمام امورِ کائنات کی ذمہ داری ہے اور یہ ایسا دردِ سر ہے کہ خداوند عالم ہی اسے گوارا کر سکتا ہے ۔ میں تو اس خدائی اور کارفرمائی کے نام سے بھی کانپتا ہوں اور اسے دردِ سر سے کم نہیں سمجھتا ۔ لیکن بندگی اور اطاعت ایک

نہایت خوفناک مصیبت ہے۔ جو اس دردِ سر کے مقابلہ میں دردِ جگر سے کم نہیں۔ اور بہرحال دردِ جگر پر دردِ سر کو ترجیح دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ایک ابتلائے حکم اور دوسرا تعمیلِ حکم ہے۔

غالب کا شعر ہے:۔

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

یعنی ایمان رکوع و سجود میں نہیں بلکہ وفاداری کے عہدِ صادق کا نام ایمان ہے۔ اس لیے جس برہمن نے تادمِ زیست بت پرستی کی ہو اور بت کے قدموں ہی پر جان دے دی ہو۔ وہ اس بات کا مستحق ہے کہ مرنے کے بعد مجھ سے اچھا مقام حاصل کرے۔

علامہ اقبال کہتا ہے:۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

یعنی اگر تپشِ عشق سے غیر مسلم کا دل بھی متاثر ہو تو وہ صاحبِ ایمان ہے۔ لیکن اگر مردِ مسلمان ہزار سجدے کرنے کے باوجود بھی تنگ دل اور تیرہ باطن رہے تو وہ ایمان سے محروم ہے۔ مطلب یہ کہ ایمان صفائے قلب میں ہے ورنہ خالی آرائشِ گفتار و زینتِ لباس تو مہا پاپ اور سب سے بڑی بے ایمانی ہے۔

پھر کہا ہے:۔

علم کی حد سے پرے بندۂ مومن کیلئے — لذتِ شوق بھی ہے نعمتِ دیدار بھی ہے

یعنی بندۂ مومن کے لیے علمِ ظاہری کافی نہیں۔ جو بسا اوقات عقلِ انسانی کا سب سے بڑا پردہ بن جاتا ہے۔ اور قوتِ عمل کو بھی سلب کر دیتا ہے۔ بلکہ اس میں عشق کی حرارت بھی ہونی چاہئے۔ اور منزلِ عشق مقامِ علم سے بہت آگے ہے۔ اگر بندۂ مومن وہاں پہنچ جائے تو لذتِ شوق اور نعمتِ دیدار دونوں سے شاد کام رہتا ہے۔ حالانکہ عام قاعدہ کے مطابق نعمتِ دیدار کے بعد لذتِ شوق فنا ہو جاتی ہے۔

جب علم و عقل کسی کام سے عاجز آ جاتے ہیں تو وہاں عشق ہی رہنمائی اور دستگیری کرتا ہے۔ چنانچہ دنیا کی بڑی بڑی مہمیں اسی کی بدولت سر ہوئی ہیں۔ ورنہ عقل بے چاری تو سرنگوں ہو چکی تھی۔ اقبال نے کہا ہے:۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

مخلوقِ خدا کی مصیبتوں کو خالقِ ارض و سما کی جناب میں یوں بیان کیا ہے:۔

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

جب سب ارکینِ سلطنت اور عہدیدار، مکار عیار ہوں۔ اور خلقِ خدا ان سے تنگ آ کر یہ فیصلہ کرے کہ ان منصب داروں کو چھوڑ کر معرفت کے دعویداروں ہی سے داد رسی طلب کی جائے تو یہاں بھی یہ کیفیت نظر آتی ہے کہ شیخ و برہمن اور صوفی و ملا سب عیار و دغا ہیں۔

اور اب پتہ چلتا ہے کہ شیطان بر لباس میں جلوہ گر ہے۔ غرض دیر و حرم سب میں اندھیرا ہے۔ ایسی حالت میں دنیا کا کیا حال ہو۔ اور خلقِ خدا کو کون سنبھالے۔

پھر کہا ہے:۔

رہ و رسمِ حرم نا محرمانہ
کلیسا کی ادا سوداگرانہ

تبرک ہے مرا پیراہنِ چاک
نہیں اہلِ جنوں کا یہ زمانہ

اور بھی سنیئے:۔

حق را بسجودے صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو

یعنی یہ دین کے ٹھیکیدار جب خدا کے سامنے جاتے ہیں تو سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ اور جب بتوں سے دوچار ہوتے ہیں تو ڈنڈوت کرنے لگتے ہیں۔ غرض کارسازِ حقیقی اور معبودِ خیالی دونوں سے مکر و فریب کرتے ہیں۔ اور جب یہ خدا سے نہیں چوکتے تو انسان بیچارہ کو کیا بخشتے۔ اور چونکہ مساجد و منادر اور کلیسا و کنشت ہی ان کی شرانگیزیوں اور فتنہ پردازیوں کے اڈے ہیں۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ مسجد اور مندر سب کا تعزیہ ٹھنڈا کر دیا جائے۔

"ملا اور بہشت" کے عنوان سے چند لطیف اشعار قلمبند کیے ہیں۔ اس قطعہ کا آخری شعر یہ ہے:۔

ہے بد آموزیِ اقوام و ملل کام اس کا
اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

یعنی ملا کی تو زندگی اور دل لگی ہی بد آموزیِ اقوام و ملل اور بدگوئی

خلقِ خدا میں ہے۔ اور اس عیب جوئی و نکتہ چینی کے بہترین اڈے آج کل کی عبادت گاہیں ہیں۔ پس اگر تو نے اسے بہشت میں داخل کر دیا تو اس کی زندگی حرام ہو جائے گی۔ کیونکہ وہاں نہ تو مسجد ہے۔ جہاں اٹھا جا کر سب کو برا بھلا کہہ سکے۔ اور نہ کلیسا و کنشت ہیں۔ جنھیں مدِ مقابل اور حریف قرار دے کر اپنے دل کا بخار نکال سکے پس۔ بہتر یہی ہے کہ اسے جنت سے دور رکھا جائے۔

اقبال نے آزادیٔ فکر و عمل اور خودی یعنی خودداری پر کثرت سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ ایک شعر یہ ہے:۔

نہ میں عجمی نہ ہندی نہ عراقی و حجازی
کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی

وہ اپنے آپ کو کسی ملک و ملت اور کسی قوم و فرقہ سے منسوب کرنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ اس کے نزدیک یہ سب ایسی پابندیاں ہیں کہ جذبات خودی و آزادی کی پرورش نہیں ہونے دیتیں۔ نیز ان کی وجہ سے ایک انسان دوسرے انسان سے نفرت کر رہا ہے۔ اور اولادِ آدم وسعتِ فکر و نظر سے محروم ہوتی چلی جا رہی ہے۔

ایک اور شعر ملاحظہ ہو:۔

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

اُسے دینی و دنیاوی کوئی پابندی گوارا نہیں۔ بلکہ دنیا و عقبیٰ دونوں سے بے نیازی اس کا مسلک آزادی ہے

سائنس کی جدید تحقیقات یہ ہے کہ نظر آنے والے ثوابت و سیارے اور اسی قسم کے اور بھی چاند ستارے اور کرّے موجود ہیں۔

غالب کہتا ہے :-

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے

عرش سے اُدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

یعنی اگر عرش سے دوسری طرف ہمارا مکان ہوتا تو کیا اچھی بات تھی کیونکہ اس صورت میں ہمارا منظر بلندی ایک اور آسمان اور ثوابت و سیار ہوتے اور نظر آنے والا آسمان ہماری زمین قرار پاتا۔ غالب اگرچہ اور بلندیوں کا تو قائل ہے۔ مگر وہاں تک پہنچنے کے لیے صرف دستِ دعا بلند کرنے پر اکتفا کرتا ہے لیکن اقبال کہتا ہے :-

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر

چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا

ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

یعنی ستاروں سے آگے یقیناً اور جہان بھی ہیں۔ اور تلاش و تحقیق کے دروازے کھول کر وہاں تک پہنچ جانا ایسا فرضِ انسانی ہے۔ جو ابھی تشنۂ تکمیل ہے۔ جس عالمِ رنگ و بو میں تم آباد ہو۔ مت سمجھو کہ دائرہ حیات یہیں ختم ہو گیا بلکہ اسی طرح کے بہت سے عالم موجود ہیں۔ جنہیں آباد کیا جا سکتا ہے اور چونکہ بنی نوعِ انسان اور اشرف المخلوقات ہو اس لیے تلاش و تحقیق اور

عمل و مصروفیت تمہارا فرض انسانی ہے اگر تم ایک دفعہ احساس فرض کے ساتھ مصروف عمل ہو جاؤ تو نئی زمینوں اور نئے آسمانوں کا ابدی سلسلہ قائم ہو سکتا ہے۔

پھر کہتا ہے:۔

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا

حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

یعنی جتنے معلوم مقامات ہیں ان سب سے آگے غیر معلوم مقامات بھی ہیں جن کا نہ صرف سراغ لگانا بلکہ وہاں تک پہنچ جانا تیرا فرض ہے۔ اور حیات صرف اسی چیز کا نام ہے کہ ہر ساعت زندگی میں آگے ہی قدم بڑھتا رہے۔

اقبال بحر تصوف کا بھی ایسا غواص ہے کہ زمین کی تہہ تک نکال لاتا ہے ذیل کے دو مصرعوں کا شعر دیکھنے سے ارباب ذوق ونظر پر روشن ہو سکتا ہے کہ ترجمان حقیقت شاعر کس مقام بلند پر متمکن ہے:۔

وہی اصل مکان ولا مکان ہے

مکان کیا شے ہے! انداز بیاں ہے

خضر کیونکر بتائے۔ کیا بتائے

اگر ماہی کہے۔ دریا کہاں ہے!

یعنی سوائے ذات احدیت کے کوئی چیز فی الحقیقت موجود نہیں ہے۔ یہ زمین وآسمان اور مکان ولا مکان محض انداز بیان اور مرگ وزیست صرف حسن ادا ہے۔ جن کا وجود اسی وقت تک محسوس ہوتا ہے۔ جب تک

تو خود فراموشی میں مبتلا ہے۔ لیکن اگر تیرا قلب حساس اور دل درد آشنا ہو۔ تو راز حقیقت تجھ پر منکشف ہو سکتا ہے۔ مگر یہ راز بتانے سے سمجھ میں نہیں آتا بلکہ اس کی گرہ کشا تیری تحقیق خودی ہی ہو سکتی ہے۔ اور خودی تیرے اندر اور تو اصل ذات کے اندر موجود ہے۔ لیکن پھر بھی تو پوچھے۔ کہ کہاں ہے۔ تو یہ ایسی ہی بات ہے۔ جیسے ماہی خرد سے سمندر کا پتہ دریافت کرے حالانکہ وہ ہر وقت سمندر ہی میں رہتی ہے

اقبال ایک مومن خالص کی نظر سے تمام دنیا کو دیکھتا ہے۔ وہ غریبوں بیکسوں کو فارغ از آلام اور مسکینوں محتاجوں کو شادکام دیکھنے کیلیے بیتاب ہے۔ بندگان خدا کی محکومی و غلامی سے اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ بنی نوع انسان کی مظلومی و مجبوری سے اس کے سینہ میں داغ لگ جاتا ہے۔ اور خلق اللہ کی ابتری و بیکسی پر اس کے جگر میں ناسور پڑ جاتے ہیں۔ وہ ایک ایسی حقیقی مساوات کا علمبردار ہے جس میں نہ کوئی حاجت مند ہو۔ نہ حاجت روا اور نہ کوئی ڈرنے والا باقی رہے نہ ڈرانے والا۔ اس شریف جذبہ انسانیت سے متاثر ہو کر اس نے "فرمان خدا" بنام فرشتگان میں اپنے احساس قلب کا یوں اظہار کیا ہے۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے — کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
جس کھیت سے دہقان کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے — پیران کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودے صنماں را بطوافے — بہتر ہے چراغ حرم و دیر بجھا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے — میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو

اقبال کس مقام پر ہے اور کس غزل کی اسے تلاش ہے۔ شیخ اور صوفی و ملا اس کی نظر میں کون ہیں، عشق و علم کی حقیقت کیا ہے۔ اس کے متعلق ایک غزل کے چند بصیرت افروز شعر پیش کر کے میں اپنا مضمون ختم کرتا ہوں۔

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی — ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی
تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند — اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی
مری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی — شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی
شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی — رہ گئے صوفی و ملا کے غلام اے ساقی
عشق کی تیغ جگردار اڑا لی کس نے — علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

ڈاکٹر سید عبداللہ ایم۔ اے
ڈی لٹ لیکچرر یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

تشریحِ اقبال

تنقیدی مطالعہ کی ابتدا یورپ میں

علامہ اقبال کے افکار کا تنقیدی مطالعہ ان کی زندگی ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں ڈاکٹر نکلسن نے اُن کی مثنوی اسرار خودی کو انگریزی زبان میں ترجمہ کیا جس کے ذریعہ غالباً پہلی مرتبہ مغربی دنیا اقبال کے فکر سے آگاہ ہوئی۔ اس کے بعد بہت سے انگریز اہل علم نے اقبال کی طرف توجہ کی مثلاً ڈکنسن نے "نیشن ویکلی" The Nation Weekly میں اسرار خودی پر تبصرہ کیا۔ اسی طرح فارسٹر E. M. Forester نے رسالہ "اتھینیم" Athenium میں ریویو کرتے ہوئے فلسفۂ اقبال کا تجزیہ کیا۔

علمائے مغرب کے مطالعہ اقبال کی اس کوشش سے ایک بہت بڑا

فائدہ یہ ہوا کہ ایک ہندی مشرقی فلسفی کے خیالات دفعتاً اپنی حدود ہند سے نکل کر انگریزی جاننے والی دنیا میں پھیل گئے اور ولایت کی تحسین و اعتراف کی مہر ثبت ہو جانے کی وجہ سے ہندوستان کے مغرب پسندوں کے لیے "فکر اقبال" کچھ پہلے سے زیادہ جاذب توجہ ہونے لگا (گو یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ علامہ اقبال نے ان مبصرین کی تشریح و توضیح کو پسند نہیں کیا" چنانچہ انھوں نے ایک خط میں جو ڈاکٹر نکلسن کے نام تھا۔ ان تبصروں کا مدلل جواب دیا جس میں اپنے نصب العین اور پیش نہاد کی توضیح اور تشریح کی کوشش کی تھی۔

ہندوستان میں مطالعہ اقبال کی ابتدا

گو اقبال کو ابتدا ہی سے بے حد قبول عام حاصل ہو چکا تھا اور ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا فرد فکر اقبال کی شیرینی اور پیام اقبال کے سوز و گداز کا دلدادہ اور معترف تھا مگر افسوس ہے کہ مطالعہ اقبال کی حقیقی کوشش بہت دیر میں ظہور میں آئی۔ انجمن حمایت اسلام کے وہ عظیم الشان اجتماع کسے یاد نہ ہوں گے" جن میں علامہ اقبال اپنی قومی نظموں سے سامعین کو گرماتے" اور دلوں کو تڑپایا کرتے تھے۔ وہ دن کتنے مبارک تھے" جب قوم کا شاعر اعظم اپنے عزلت کدے سے نکل کر قومی انجمن کے اسٹیج کو مشرف کیا کرتا تھا۔ یہ مجلسیں اتنی پُرلطف اور پراثر ہوا کرتی تھیں کہ مہینوں تک سینوں ان کے تذکرے رہا کرتے تھے مگر باوجود اس قبول عام کے جو اقبال کو نصیب ہوا فکر اقبال کے گہرے اور تنقیدی مطالعہ کی طرف بہت ہی توجہ نہیں کی گئی۔ یہ صحیح ہے کہ اس صورت حال کے چند در چند اسباب تھے لیکن اس واقعہ سے بطور واقعہ انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مطالعۂ اقبال کی مخلصانہ کوشش

غالباً ۱۹۲۶ء یا ۱۹۲۷ء میں اہلِ ملک کو اس ضرورت کا کچھ احساس ہوا، اس وقت تک علامہ کی بہت سی تصانیف شائع ہو چکی تھیں، تحریکِ خلافت کے ہنگامے سرد ہو چکے تھے، پیکار اور آویزش کے ولولے سٹ چکے تھے، عدم تعاون اور ہندو مسلم اتحاد کی ناکامی نے سوچنے والے دماغوں اور محسوس کرنے والے دلوں کو سوچنے اور فکر کرنے پر مجبور کر دیا تھا، ہندو اور مسلمان اپنے اپنے مطمحِ نظر کے صواب و خطا پر غور کرنے لگے تھے، اس ذہنی خلفشار کے زمانے میں پیغامِ اقبال کی جانب کچھ سنجیدگی کے ساتھ توجہ ہونے لگی چنانچہ تھوڑے عرصہ میں کچھ کتابیں، کچھ رسالے، کچھ مضامین فکرِ اقبال کی تنقید میں شائع ہو گئے، پہلا یومِ اقبال ۱۹۳۸ء میں لاہور میں منایا گیا، جس کی ایک تقریب میں خود علامہ نے بھی شرکت فرمائی، اس کے بعد اور ایک دو قابلِ قدر کتابیں شائع ہوئیں جو علامہ کی نظر سے بھی گزریں۔

آخری دور میں علامہ اقبال کی مایوسی

مگر علامہ کی زندگی میں ان کی حکمت کے مطالعہ کے سلسلہ میں جو کچھ ہوا، علامہ اس پر بالکل مطمئن نہ تھے، نوجوانانِ ملک سے انہیں جو توقعات تھیں، وہ پوری نہ ہوئیں، فکرِ اسلامی کے احیاءِ ثانی کے سلسلہ میں اُن کے جس قدر ارادے تھے، ایک ایک کرکے ناکام رہے، مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کی آرزوئیں قوت سے فعل میں نہ آئیں، سب سے زیادہ یہ کہ علومِ اسلامیہ کی تجدید کے متعلق اُن کے سارے خیالات طلسمِ باطل ہو کر رہ گئے، یہی وجہ ہے کہ "ارمغانِ حجاز" کی اکثر رباعیاں تنہائی کے احساس سے معمور نظر آتی ہیں جن میں "ہمرہانِ سست عناصر" کے شکوے ہیں، اور

رفیقان کو ناواہا کہے گئے" "ہم نفسانِ خام" کی کور ذوقی کا ماتم ہے، اور "سلطانِ غور" کی بے نوائی کا نوحہ۔

اقبال کو سب سے زیادہ گلہ ان ناشناس تحسین گذاروں کا تھا جو انہیں محض غزل خواں اور ان کی حکمت کو نوائے شاعری سمجھتے رہے۔ اُن کے احول کی بے بصیرتی اور اُن کی ناکامی کا گہرا اثر اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال اپنے زمانہ اور اپنے ماحول سے مایوس ہو کر اپنے کو مستقبل کا "پیام آور" کہنے لگے۔ ارمغان صفحہ ۲۲۲ میں فرماتے ہیں:-

نخستین لالۂ صبح بہارم | بپائے سرو ز داغے گردادم
بچشم کم مبیں تنہا نجم را | ز من صد کاروان گل در کنارم

اس سے یہ بات بخوبی ظاہر ہوتی ہے کہ علامہ مرحوم قوم میں جس قسم کا جذبۂ انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے اپنی زندگی میں اس کا دیکھنا ان کو نصیب نہ ہوا۔

۱۹۳۸ء میں جب علامہ اقبال کا انتقال ہو گیا اس وقت آسودگی پسند قوم کو اس متاعِ گراں مایہ کے لٹ جانے کا کچھ احساس ہوا۔ ماتمی جلسے ہوئے مرثیے لکھے گئے، اخبارات نے ماتمی ایڈیشن شائع کئے، رسالوں نے خاص نمبر نکالے، غرض ہر شخص نے اپنے اپنے ذوق اور اپنے اپنے طریقے سے اس حکیم الامت کے اٹھ جانے پر اپنے دلی درد اور افسوس کا اظہار کیا۔ غم و اندوہ کی یہ فضا عملی لحاظ سے کسی حد تک مفید ثابت ہوئی اور اشکبار آنکھوں نے دلوں اور دماغوں کو پیامِ اقبال پر گہری فکر و تفکر کا اشارہ کیا، چنانچہ اس حادثے کے زیر اثر تین چار سال تک افکار اور کلامِ اقبال کی تنقید و تشریح کی طرف خاص توجہ ہوئی گو اس تحریک میں سیاسی حالات بھی کسی حد تک

ممد و معاون ثابت ہوئے اور بعض صورتوں میں محض تجارتی اغراض سے بھی کار فرمائی کی مگر بالعموم اس عرصے میں مطالعۂ اقبال کی تحریک کو بہت فروغ ہوا اور اس کے متعلق بعض مفید اور وقیع کتابیں لکھی گئیں۔

گو کلامِ اقبال کے متعلق متفرق مضامین کی فہرست بظاہر طویل ہے لیکن اس کی عظمت اور بلندی کی نسبت سے اب بھی بہت تشنہ اور مختصر ہے اگر ہم صحیح اقبال کو اپنی ذہنی تاریخ میں وہی درجہ دیتے ہیں، جو انگریزوں اور جرمنوں نے شیکسپیر اور گوئٹے کو دے رکھا ہے تو ہم ان کے ساتھ اپنی محبت اور ان کے اعتراف کے بارہ میں شرمندہ ہونے پر مجبور ہوں گے انگریزی اور مغربی ادب کے واقف کاروں سے وہ طویل و ضخیم اسماء الکتب Bibliographies پوشیدہ نہیں ہیں، جن میں شیکسپیر اور گوئٹے کے متعلق کتابیں شامل ہیں مثال کے طور پر

Dr. Episck and Schucking کی (Bibliography
Shakespeare

پر نظر ڈالیے، جو بڑے سائز کے تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل ہے، اس کے مندرجات پر غور فرمائیے اور بتائیے کہ کیا شیکسپیر کی زندگی، ذہن، کلام، آرٹ اور شخصیت کا کوئی ایسا گوشہ ہے جو اس کے محققوں کی نگاہ اور بصیر تفکروں سے اوجھل رہا ہو؟ اسٹراٹفورڈ کی بستی کا وہ گھر جس میں شیکسپیر رہا کرتا تھا، آج بھی ایک زیارت گاہ بنا ہوا ہے بلکہ اس کا سامانِ نوشت و خواند، اس کی دوات اور قلم اور اس کے قلم کے تراشے تک یادگار کے طور پر محفوظ و موجود ہیں۔

مطالعۂ اقبال کی تحریک کی کمزوری کے اسباب بہت سے ہیں۔ مرحوم کی وفات کے بعد بعض اربابِ سیاست نے قدر دانی اور سرپرستی کے پردے میں

فکرِ اقبال کو جس رنگ میں پیش کیا' اور ان کے فلسفہ و حکمت کو جس طرح اغراضِ سیاسی کے لیے استعمال کیا' اس سے علامہ مرحوم کے مشن کو شدید نقصان پہنچا' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انقلاب کا پیغام جمودکی دعوت بن کر رہ گیا' اور عمل کا خروش بزمِ نغمہ' خواب آور ثابت ہوا

دقت اور دشواریاں

دوسرا سبب کلامِ اقبال کی دشواری اور دقت ہے جس کی وجہ سے اس کا بڑا حصہ نہ صرف عوام بلکہ متوسط گروہ کے لیے بھی تقریباً ناقابلِ فہم ہے' غلام آباد ہند کی گھٹی ہوئی سیاسی فضا میں مرغانِ چمن کے لیے آزادی کے گیت گانا بیحد دشوار ہے' اس پر طرّہ یہ کہ اقبال جس گروہ کو مخاطب کرنا چاہتے تھے' اس کی خاکساری اور پست ہمتی کا ان کو پورا اندازہ تھا' اس لئے وہ اپنے دل کی بات صاف صاف کہہ دینے کے بجائے رمز و کنایہ کے پیرایہ میں کہنے پر مجبور تھے۔ خود کہتے ہیں:۔

دقت بریں گفتن است من بہ کنایہ گفتہ ام
خود تو بگو کجا برم ہمنفسان خام را

شعر اور پیغام

شعر اور آرٹ کی خوبی بڑی حد تک اس کے ایجاز اور ایمائیت پر موقوف ہے' اس لئے شعر کے قالب میں وہ پیغام مشکل سے سما سکتا ہے' جو عوام اور متوسط طبقوں کے لیے ہونے کے باعث صراحت چاہتا ہو خصوصاً جبکہ شاعر کے ذہن و فکر پر دوسری خارجی پابندیاں بھی عاید ہوں' فلسفہ اور شعر علامہ کے خیال میں خود گریز کے بہانے ہیں' جن کے ذریعہ شاعر دانستگان انظار حقیقت سے بچنے کیلئے ...ابہام اور کنایوں سے کام لیتا ہے۔

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرف تمنا جسے کہہ نہ سکیں رو برو

فارسی زبان ذریعۂ اظہارِ خیال

چوتھا سبب یہ ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے فنِ شعر کے اظہار کے لیے بیشتر فارسی زبان کو استعمال کیا ہے۔ ہندوستان میں ادبیاتِ فارسی کا ذوق اب اس درجہ کم ہو رہا ہے کہ لوگ آہستہ آہستہ فارسی شعر و شاعری کے حقیقی لطف سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ کالجوں کی "دم بریدہ" تعلیمِ فارسی ادب کا صحیح ذوق نہیں پیدا کر سکتی، اور وہ طلبہ بھی جو فارسی کے اچھے طالب علم سمجھے جاتے ہیں فارسی شاعری کے اجزائے ترکیبی سے بے خبر ہونے کے باعث اپنے قدیم شعراء کو لغو گو اور ان کی شاعری کو بیہودہ قرار دیتے ہیں۔ انھیں تعجب ہے کہ رومی، حافظ، سعدی، نظیری اور غالب نے شیکسپیئر، براؤننگ، شیلے اور کیٹس کی طرح کیوں نہیں کہا! جو فارسی ادبیات کے ذوق سے ان کی محرومی کا نتیجہ ہے!

حکیمانہ اصطلاحات اور تراکیب

اقبال کی زبان حکیمانہ اصطلاحوں اور ترکیبوں سے پُر ہے۔ عام خصوصیات کے اعتبار سے اقبال پر حافظ، نظامی، جلال اسیر، علی قلی سلیم، سالک یزدی، رضی دانش، ابو طالب کلیم، طالب وغیرہ کی زبان کا بڑا اثر ہے، لیکن حکیمانہ مضامین کے لیے انھوں نے رومی، قاآنی، بیدل اور غالب کی زبان استعمال کی ہے۔ غزل کی زبان شیریں ہے، لیکن حکیمانہ مضامین کے لیے جو الفاظ اور ترکیبیں انھوں نے استعمال کی ہیں، وہ بیشتر تشریح طلب اور دقیق ہیں، جس کی بنا پر متوسط درجے کے تعلیم یافتہ اشخاص کے لیے

کلام اقبال بڑی حد تک ناقابل فہم ہو گیا ہے، میں نے "شعرائے فارسی اور علامہ اقبال" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا ہے، جس میں اس قسم کے تمام مباحث پر مفصل تبصرہ کیا ہے، یہاں صرف اس قدر عرض کرنا کافی ہوگا کہ اقبال اکابر شعرائے فارسی کے وارث، اور صوفیہ اور علمائے اسلام کے سلسلے کی ایک کڑی تھے، اس لیے ان کے کلام کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے کیلئے فارسی زبان اور ادب سے کامل واقفیت کی ضرورت ہے۔

مضمون اور معنی کی دشواریاں

مطالعۂ اقبال کے سلسلہ میں زبان اور الفاظ کی دشواریوں سے کہیں زیادہ مضمون اور معانی کی دقتیں ہیں۔ اقبال حکیم تھے، "ساز سخن" تو حرفِ آرزو کے اظہار کے لیے ایک بہانہ تھا، جو لوگ ان کی نوائے پریشاں کو محض شاعری سمجھتے ہیں، وہ کلام اقبال کی عظمت کے محرم نہیں، وہ محض غزل خوانی کے لئے نہیں پیدا کئے گئے تھے، بلکہ "محرم راز درون میخانہ" تھے، قدرت نے انھیں تجدید اور انقلاب کے لیے پیدا کیا تھا، وہ مفکرین اسلام کے کاروان مقدس کے ایک ممتاز فرد تھے، ان کا کلام اسلام اور اسلامیات کے گہرے اور وسیع مطالعہ کا آئینہ دار ہے، ان کے اشعار میں کلام مجید، احادیث نبوی، اسلامی فلسفہ و حکمت کے جواہر ریزے، متکلمین اور علماء کے شہ پارے، صوفیہ اور ائمہ کے بلند خیالات، اہل عرفان اور ارباب کشف کے مقامات و احوال کی طرف جابجا اشارے ہیں، گزشتہ تیرہ سو سال میں اسلام کے آغوش میں پلنے والی مذہبی، علمی، سیاسی اور مذہبی تحریکوں کی تاریخ، اقوام عالم کے قدیم و جدید ہیجانات، ملل و مذاہب جدیدہ کا ارتقا، خلافت سلطنت اور ملوکیت کا عروج و زوال، مغرب اور حکمائے مغرب کے

نظریے اور تصورات غرض انسانی تہذیب و تمدن کے تمام اہم پہلوؤں پر فلسفیانہ تبصرے کلام اقبال میں مفصلاً و مجملاً موجود ہیں، جن سے واقفیت کلام اقبال کے حقیقی مقصود تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے، چونکہ مسلمان اب عموماً علوم اسلامیہ اور تاریخ اسلام سے بے خبر اور ناواقف ہو چکے ہیں اس لیے اس شبہ کے پورے پورے امکانات موجود ہیں کہ ہم ابھی تک علامہ اقبال کی تعلیمات کے عمیق اور اصلی مفہوم سے شاید بہت دور ہیں، علامہ اقبال کا نام سن کر یا ان کا شعر پڑھ کر بہت سے لوگ سر دھننے لگتے ہیں اور بعض پر تو وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو قابل مسرت اور لائق مبارکباد ضرور ہے، لیکن یہ جذب و سرور اور قبول عام محض سیاسی قسم کا ہے، اس کی مذہبی اور علمی بنیاد بہت کمزور ہے، اور علامہ کے مقصد حیات کے ادراک و فہم سے شاید اسے دور کا واسطہ بھی نہیں، اسی بے خبری کا ایک نتیجہ ہے کہ اس وقت ہماری قوم کے بعض تنگ نظروں کے نزدیک علامہ اقبال کی ساری تعلیم صرف "نفی وطنیت" اور "عناد ولایت" سے عبارت ہے، حالانکہ تعلیمات اقبال کے وسیع سمندر میں یہ دو امور قطرے کی نسبت رکھتے ہیں اور ان کا بھی وہ مفہوم و مقصد نہیں جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے، ان کے علاوہ کلام اقبال میں بیشمار انمول موتی موجود ہیں، جن کو نگاہ میں رکھنے کے بعد اقبال کو محض "وطن اور ولا" کا قائل قرار دینا مولانا شبلی کے اس شعر کی یاد کو تازہ کرتا ہے

نہیں سے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندو کش تھا ظالم تھا، ستمگر تھا

مطالعہ اقبال کی ان کمزوریوں کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ

کیا واقعی اقبال ابھی تک ایک راز سربستہ ہے اور تعلیم یافتہ حضرات کا دعاوی جوش و خروش محض بے بنیاد اور زبانی ہے۔ میرے خیال میں کلامِ اقبال کے قدر دانوں کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ مطالعۂ اقبال کی دشواریوں کو رفع کرنے کے لیے کوئی موثر قدم اٹھائیں اور پیامِ اقبال کو سہل اور آسان تر بنا کر ہر بچے جوان اور بوڑھے تک پہنچائیں۔ مطالعۂ اقبال کے جو امور جن کی طرف خاص توجہ کرنے کی ضرورت ہے یہ ہیں:

(۱) فرہنگِ مشکلاتِ اقبال
(۲) مبادیِ اقبال کی تشریح
(۳) اقبال کے ماخذ اور اطراف کا مطالعہ اور تجزیہ۔
(۴) مسائلِ عظیمۂ اقبال کی تشریح
(۵) مطالعۂ اقبال کی نہایات و غایات۔
(۶) دائرۃ المعارفِ اقبال

وہ امور جو میرے نزدیک مبادیِ اقبال کا درجہ رکھتے ہیں یہ ہیں
(۱) اقبال کی شخصیتیں۔
(۲) اقبال کی تلمیحات اور اصطلاحاتِ علمی
(۳) اقبال کی تضمینیں
(۴) اقبال کے استعارے، فرضی نام اور نشانات
(۵) جغرافیائی نام
(۶) اقبال کے سرچشمہ ہائے فیض یا ماخذ۔
(۷) اقبال کے اہم مسائلِ علمی کی تمہیدی واقفیت۔

اقبال کی شخصیتیں اقبال کے کلام میں عہدِ قدیم اور عہدِ جدید کی بہت سی شخصیتوں کا ذکر آتا ہے، ان میں سے بعض علمی اور روحانی ناموروں کا تذکرہ تو خود اقبال کے ذکر میں آئے گا لیکن اُن کے علاوہ اقبال کے "ہیروز" اور بھی ہیں، جن کی یاد کو اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعہ زندہ کرنے کی کوشش کی ہے، ان میں سے بعض ایسے ہیں جن کی سیرت کی عظمت سے اقبال متاثر ہیں، مگر بعض ایسے بھی ہیں جن کی سیرت عبرت پذیری اور نصیحت آموزی کے لیے ہمارے سامنے پیش کی گئی ہے۔

اقبال کی شخصیتوں کا دائرہ بہت وسیع ہے، ان میں انبیاء علیہم السلام بھی ہیں اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی، بادشاہ بھی ہیں اور سیاست داں بھی، اربابِ رزم بھی ہیں اور اصحابِ بزم بھی، مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی، خداشناس بھی ہیں اور طاغوت پرست بھی، صلحا بھی ہیں اور فساق بھی، غرض قدیم و جدید تاریخِ عالم کی بیشتر نمایاں شخصیتیں کلامِ اقبال کے ضمن میں زیرِ بحث آئی ہیں۔ مطالعۂ اقبال کے سلسلہ میں ان مشاہیر کا مجمل تعارف ازبس ضروری ہے، تاکہ عام مطالعہ کرنے والے حضرات ان ناموروں کے خاص اوصاف و خصائص پر غور کر سکیں جن کی خاطر اقبال نے ان کا تذکرہ اپنے اشعار میں کیا ہے۔

مثال کے طور پر جاوید نامہ کے بعض اشخاص کو لیجیے، مثلاً شرف النسا، صادق اور جعفر اور سید جمال الدین افغانی وغیرہ۔

اقبال کی تضمینات اقبال کے کلام میں تضمینات بھی بکثرت ہیں بانگِ درا، پیامِ مشرق، جاوید نامہ، ضربِ کلیم،

زبورِ عجم، اور بالِ جبریل میں شعراء کے اشعار کی بہت سی تضمینیں ملتی ہیں۔ جن میں سے بعض مشہور و معروف ہونے کی وجہ سے محتاجِ تعارف نہیں مگر بعض ایسی بھی ہیں، جن کا مجمل علم، اقبال کے مطالعہ کرنے والے کے لیے بے حد ضروری ہے۔ مثلاً انیسی شاملو، ملا عرشی، فیضی، رضی دانش، ملک قمی، صائب، عنی، مرزا مظہر جانجاناں وغیرہ کی تضمینات۔

تضمینوں کے سلسلے میں یہ بھی بتانا ضروری ہوگا کہ کسی خاص شاعر کو اقبال نے کیوں پسند کیا، اور جس شعر کو تضمین کے لئے انتخاب کیا گیا ہے اس میں کیا خاص خوبی ہے، یا اس کو ان کے موضوع بحث سے کیا تعلق ہے۔

میں نے اس بحث کو اپنے ایک مضمون "اقبال کے محبوب فارسی شاعر" میں قدرے تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس موقع پر میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔

مندرجہ بالا فہرست شعراء میں ایک شاعر رضی دانش بھی ہے، اقبال نے اس کے ایک شعر کی تضمین کی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کو رضی کے اس شعر کی شوخی سے دلچسپی پیدا ہوئی۔

تاک را سرسبز کن اے ابر نیساں در بہار
قطرہ تا مے تواند شد چرا گوہر شود

اس کے جواب میں دارا شکوہ نے یہ شعر لکھا تھا۔

سلطنت سہل است خود را آشنائے فقر کن
قطرہ تا دریا تواند شد چرا گوہر شود

ان شعراء کے حالات معلوم ہونے کے بعد یہ سمجھنا نسبتہً آسان ہوجائے گا

کہ ان کی سیرت اور شاعری میں اقبال کیلئے کیا خاص وجہ کشش تھی' ان تضمینوں کا جائزہ لینا اس اعتبار سے بھی ہمارے لیے مفید ہے کہ ہم ان کے ذریعہ اقبال کی محبوب کتابوں اور مطالعہ کتب کے سلسلے میں ان کے طریقوں سے بھی واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔

اقبال کی تلمیحات اور کتابوں کے حوالوں کی تشریح بھی اسی ضمن میں آتی ہے' تلمیحات کا ایک حصہ فرہنگ اقبال میں شامل ہونا چاہئے' لیکن بعض تلمیحات ایسی بھی ہوں گی جو اس میں شامل نہیں کی جا سکتیں' ان کی تشریح کے لیے شارح کو الگ انتظام کرنا ہو گا' کلام اقبال میں بہت سی کتابوں کا ذکر آیا ہے' وہ بھی اسی قبیل سے ہیں' ایک عام مطالعہ کرنے والا بسا اوقات ان اجنبی اور نامانوس ناموں سے گھبرا اٹھتا ہے' اور اقبال سے شیفتگی کے باوجود مطالعہ کلام کو ترک کر دیتا ہے۔

اقبال کے پسندیدہ اماکن ومقامات

عقائد و خیالات اگرچہ روحانی حقائق کا درجہ رکھتے ہیں' اور ان کو کسی خاص مکان اور مقام کے ساتھ محدود اور وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اقوام کی تاریخ میں مکان اور مقام کو ہمیشہ سے بڑی اہمیت حاصل رہی ہے' قید مقام سے آزاد ہونے کے باوجود' اقوام اپنے ماضی کی خوش گوار یادگاروں کو زندہ رکھنا چاہتی ہیں' اور ان کے لیے اپنے دل میں اس درجہ محبت رکھتی ہیں کہ ان کا تذکرہ سوئی ہوئی عصبیتوں کو جگا سکتا ہے' اور مردہ حسیات کی بیداری کا ذریعہ بن جاتا ہے' اقبال کے کلام میں اسلامی دور کے بعض شہروں کا تذکرہ بار بار آتا ہے' یہ وہ شہر ہیں جو کسی زمانہ میں اسلامی عظمت اور تہذیب کے مرکز تھے' ان کے در و دیوار سے علم اور تمدن کے

سرچشمے جاری تھے اور ان کے علمی گروہوں میں شرف انسانیت کا دور دورہ تھا۔ اقبال کی شاعری تہذیب و ثقافت کے ان کھنڈروں کی مرثیہ خوان ہے۔ اگر ہم ان محبوب بستیوں کے ساتھ اقبال کی وابستگی کی وجوہ سے واقف ہو جائیں گے تو یقیناً ہم پیام اقبال کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں گے۔ جہاں آباد دہلی، کابل، تبریز، روم، قرطبہ، شیراز، رودکا ویری، وادی الکبیر، وادی لولاب کی طرح بے شمار شہر اور مقام ہیں، جن کی خصوصیات کا جاننا ہمارے ابتدائی فرائض میں سے ہے۔

اقبال کے اہم علمی مسائل کی تشریح

مطالعہ اقبال سے پہلے بطور تمہید مقدمے یا دیباچے کی صورت میں ان اہم علمی مسائل کا مختصر اور سادہ تجزیہ ہونا چاہیے، جن سے پیام مشرق، زبور عجم، جاوید نامہ بلکہ سب کتابیں لبریز ہیں۔ حکمائے مشرق کی طرح اقبال نے حکمائے مغرب سے بھی بہت زیادہ استفادہ کیا ہے، اس لیے کلام اقبال میں جا بجا مشرقی اور مغربی حکمت کے بعض مسائل کی طرف اشارات ہیں، بعض اشعار میں کسی اسلامی یا مغربی حکیم کی پوری حکمت کا خلاصہ بیان ہوا ہے، کہیں کہیں خاص علمی اصطلاحات ہیں، عام مطالعہ کرنے والے عموماً صرف لطف زبان سے لذت گیر ہو کر آگے چل دیتے ہیں اور شعر کے اصلی مفہوم سے ناواقف رہتے ہیں، اس لیے اس قسم کی علمی اصطلاحوں اور فلسفہ و حکمت کے مسائل و مباحث کی آسان تشریح ابتدائی لوازم میں سے ہے۔ اس کی تشریح کے لیے دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ اقبال نے پیام مشرق کے باب "نقش فرنگ" میں "صحبت رفتگان" کے عنوان سے ایک مکالمہ لکھا ہے جس میں بعض حکمائے جدید و قدیم نے اپنے مسائل کا تذکرہ ایک ایک

وہ دو شعروں میں کیا ہے۔ ان میں سب سے پہلے "الشاقی" پھر کارل مارکس پھر ہیگل' پھر مزدک اور اس کے بعد کو کمن لب کشا ہو کر اپنا فلسفہ بیان کرتے ہیں۔ ہیگل کہتا ہے :-

حبلہ دہد باغ وزاغ مُعنی مستور را
عینِ حقیقت نگر خنظل و انگور را
فطرتِ اضداد و خیز لذت پیکار داد
خواجۂ مزدور را آمر و مامور را

ان اشعار کے ساتھ ہیگل کے مخصوص فلسفۂ جدل و پیکار کی شرح کس قدر ضروری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ذیل کے اشعار میں برگساں کی حکمت کا جو خلاصہ موجود ہے اس کو نمایاں اور متعین کرنے کی ضرورت ہے۔

پیغام برگساں کے عنوان سے یہ اشعار پیام مشرق میں ہیں۔

تا بر تو آشکار شود راز زندگی
خود را جدا ز شعلہ مثال شرر مکن
بر نظارہ جز بنگہ آشنا میار
در مرز و بوم خود چو غریبان گزر مکن
نقشے کہ بستہ ہمہ اوہام باطل است
عقلے بہم رسان کہ ادب خوردۂ دل است

آخری مصرعے میں برگساں کا فلسفۂ الہام و تحقیق بیان ہوا ہے۔ اس کے سمجھنے کے لیے برگساں کے خیالات کا ایک خلاصہ کتاب میں ہونا ضروری ہے۔ پیام مشرق میں ایک دوسرے مقام پر حکمائے مغرب کی حکمت کا بیان ایک ایک شعر میں ہوا ہے :-

لاک | ساغرش را سحر از بادۂ خورشید افروخت
ورنہ در محفلِ گل لالہ تہی جام آمد

گوئٹے | فطرتش ذوقِ مے آئینہ فامے آورد
از شبستانِ ازل کوکبِ جامے آورد

برگساں | نمے از ازل آوردہ نہ جامے آورد
لالہ از داغِ جگر سوزِ دوامے آورد

اس کے بعد بعض شعراء کے پیغام کی خصوصیت ان اشعار میں بیان ہوئی ہے:—

براؤننگ | بے ثبات بود بادۂ سرجوشِ زندگی
آب از خضر گیرم و در ساغر افگنم

بائرن | از منّتِ خضر نتوان کرد سینہ داغ
آب از جگر بگیرم و در ساغر افگنم

غالب | تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

رومی | آمیزشے کجا گہرِ پاکِ تاک را | از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم

ان اشعار میں ہر شاعری کی شاعری کا لب لباب موجود ہے جس کو سرسری رہنمائی کے بغیر سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔

اس کے علاوہ حکمت، فلسفہ، سیاسیات، اجتماعیات، مذہب اور روحانیت سے متعلق بیسیوں اشارے کلام اقبال میں اس انداز سے آجاتے ہیں کہ ان کی اہمیت معلوم کئے بغیر مطالعہ کرنے والا آگے نہیں بڑھ سکتا۔ مثلاً خودی کا سرسری مفہوم، جہاد اور کشمکش کا ابتدائی تصور، فقر اور اس کی عارفانہ تشریح، عشق، جمال اور جلال کی تعبیر، تقدیر اور توحید کے معانی، جمہوریت، حریت اور اشتراکیت کی مجمل تعریف، فلاسفہ یورپ کے خیالات کا خلاصہ، ان تمام امور و مسائل کے تمہیدی پہلوؤں سے واقف ہونا ضروری ہے، ورنہ اصحاب علم و نظر کے علاوہ، عام مطالعہ کرنے والوں کے بیشتر طبقات کلام اقبال کے متعلق غلط فہمیوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ اس لیے کہ فکر اقبال درحقیقت خواص اور علماء کے غور و فکر کے لیے ہے، عوام تشریح و تعبیر کے بغیر اس سے متمتع نہیں ہو سکتے۔

میں اس سلسلے میں ناظرین کرام کو خودی کے تصور کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں تصوف نے آج تک "خود" کو مٹانے اور خودی کو فنا کرنے کی تلقین کی ہے حضرت شیخ ابو سعید ابوالخیر فرماتے ہیں:۔

با اوسر نشین و با خود منشین

لسان الغیب حافظ فرماتے ہیں:۔

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست
تو خود حجاب خودی حافظ از میان برخیز

ہمام تبریزی بھی اسی قسم کا خیال ظاہر کرتے ہیں:۔

در میانِ من و محبوب حجاب است ہماں

باشد آں روز کہ آں ہم زمیان برخیزد

نفی خودی تصوف کا بنیادی عقیدہ ہے کیونکہ خودی کا احساس صوفیہ کے نزدیک ایک گناہ ہے:

وجودک ذنب لا یقاس بہا ذنب

اس عقیدے کی بنیاد اس خیال پر قائم ہے کہ انسان دراصل گلشنِ قدس کا ایک پھول تھا اور ذاتِ باری کا جزو۔ خداوند تعالیٰ کے شوقِ ظہور نے دنیا کو پیدا کیا اور انسان کو اس نئی بستی کا حاکم اور مالک بنایا گویا کل نے جزو کو عارضی طور پر اپنے آپ سے الگ کر دیا۔ اب یہ جزو کل سے ملنے کے لیے بیقرار ہے جب تک حجابِ جسمانی موجود ہے یہ جزو کل سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا صوفیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ خود کو مٹانا ہی تمام مسرتوں کا سرچشمہ اور راحتوں کا منتہا ہے۔ اس خیال کو تمام صوفی شعراء بڑی قوت اور بڑے جوش کے ساتھ ظاہر کرتے آئے ہیں۔

خواجہ حافظ فرماتے ہیں:

من ملک بودم و فردوس بریں جایم بود

آدم آورد دریں دیرِ خراب آبادم

نظیری کی یہ غزل بھی اسی مضمون کی حامل ہے

دراں گلشن ہما بودم کہ ہستی تار و از نرگس

دراں مجلس صفا بودم کہ عشق از حسن شد پیدا

بزحمت اتصال افتد ہمہ چوں خود ز ہم بیدا ز ہم

کہ تو رحمت قطرہ دریا نہ شود چوں قطرہ شد دریا

رومی کی مثنوی کے ابتدائی اشعار کا مضمون بھی یہی ہے۔

از نیستاں تا مرا ببریدہ اند — از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق — من چہ گویم شرحِ دردِ اشتیاق

تصوف کے اس عقیدے کا اثر اس قدر گہرا اور ہمہ گیر ہے کہ خود علامہ اقبال نے اپنی ابتدائی نظموں میں یہ رنگ قبول کیا اور یہی صوفیانہ نے نکالی چنانچہ ایک نظم میں فرماتے ہیں:

مجھ سے خبر نہ پوچھ حجابِ وجود کی
شامِ فراق صبح تھی میری نمود کی
وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا
زیبِ درختِ طور مرا آشیانہ تھا (وغیرہ)

اس سے یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ خودی کو جو کل وجود میں تفرق کا سبب سمجھنا تصوف کے مسائل مہمہ میں سے ہے، اس کے برعکس اقبال نے خودی اور بے خودی کا ایک نیا تصور ہمارے سامنے رکھا ہے، جس کا مفہوم معاشیاتی، نفسیاتی، سیاسی یا عمرانی ہے۔ اسرارِ خودی سے لے کر ارمغانِ حجاز تک سب کتابوں کا یہ تصور روحِ رواں کا درجہ رکھتا ہے جس طرح گوشت کو ناخن سے جدا نہیں کیا جا سکتا اسی طرح تصورِ خودی کو اقبال کے نظامِ فکر سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ خودی کا یہ تصور بظاہر تصوف کے عقیدۂ "خودی" کے بالکل ضد ہے۔ اگر صوفی خودی کو مٹا کر کمال کی معراج پر پہنچنے اور ہو جانے کا مدعی ہے، تو اقبال خودی کی تربیت کے ذریعے شرفِ انسانیت کو اعلیٰ مدارج سے روشناس کرانے کا دعویدار۔ ایک کے نزدیک خودی کی موت میں حیات ہے اور دوسرے کے نزدیک خودی کی تربیت میں زندگی اور اس کی موت میں ممات ہے۔ یہ ایک تضاد ہے، اور بہت بڑا

تضاد ہے جس کو رفع اور دونوں مسائل کا ابتدائی تجزیہ کرنا مطالعہ اقبال کی تسہیل کے لیے ضروری مبادی میں سے ہے۔

مندرجہ بالا تصریحات سے ایک اور ضروری سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ اقبال تصوف کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ کلام اقبال کے ناقص مطالعہ کی وجہ سے ایک خیال عام طور پر پھیلا ہوا ہے کہ اقبال تصوف کے مخالف تھے لیکن کیا یہ خیال صحیح ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ مروجہ تصوف کے بعض بے جا اور ناقص پہلوؤں سے قطع نظر، ہماری تہذیب اور ہمارے علوم بہت بڑی حد تک صوفیوں کے اثرات حسنہ کے رہین منت ہیں۔ یہاں تک کہ علمائے ظاہر نے مذہب اور دین کی جتنی خدمت کی ہے صوفیائے کرام نے کسی طرح اس سے کم خدمت انجام نہیں دی۔ انھوں نے لوگوں کو ایمان و ایقان کی دولت سے بہرہ ور کیا۔ یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ امام ابن تیمیہ جو تصوف کے بڑے مخالف خیال کیے جاتے ہیں، وہ بھی علامہ ابن قیم کے بقول تصوف کی روح کے منکر نہ تھے۔ (ملاحظہ ہو اغاثۃ اللہفان اور مدارج السالکین)

پھر کیا علامہ اقبال اس تصوف کے مخالف ہو سکتے ہیں؟ میرے خیال میں اقبال کے متعلق یہ رائے قائم کرنا کسی طرح بھی درست نہیں۔ لیکن مسائل اقبال کی تنقیدی تشریح کے بغیر اس قسم کی بیسیوں غلط فہمیوں کے پیدا ہونے کا امکان ہے۔

علامہ اقبال تمام برگزیدہ صوفیوں کے مداح تھے، اور ان میں بعضوں کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت بھی پیش کیا ہے جو ان کے کلام میں موجود ہے لیکن آخری عمر میں منصور حلاج کی نسبت ان کا جذبۂ تحسین بہت بڑھ گیا تھا اس کی کتاب "کتاب الطواسین" اقبال کی محبوب کتابوں میں سے تھی۔ یہ امر بھی

دوسرے بہت سے مسائل کی طرح قابل تشریح ہے کہ اقبال اپنی شخصیتوں میں منصور کو اتنا اہم درجہ کیوں دیتے ہیں۔

ہمارے اقبال کے مسائل ہمہ گیر کی تشریح کے سوال کو اس لیے زیادہ اہمیت دی ہے کہ ان کے صحیح اور معین تصور کے بغیر فکر اقبال مبہم ہو کر رہ جاتا ہے اور مطالعہ کرنے والے سب کچھ پڑھ لینے کے بعد بھی بھٹکتے ہیں

ع حیرت اندر حیرت است ایں مشکل اندر مشکل است

اقبال کے سرچشمہ ہائے فیض

علامۂ اقبال نے جن ماخذ سے فائدہ اٹھایا ہے ان کی فہرست طویل ہے ان ماخذ میں کلام اللہ اور سنت رسول اللہ کے علاوہ بہت سے قدیم و جدید اسلامی و مغربی مفکرین کی کتابیں بھی شامل ہیں مگر اس وسیع استفادے کے باوجود یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اقبال نے اپنی حکمت کی اساس اسلام کے عقائد، اصولیات اور حکمائے اسلام کی حکمت عالیہ پر رکھی ہے!

Humphry treveiyan نے اپنی کتاب
"Pupular Back Ground to Goethes Heuc...an"
For Good Orill میں گوئٹے کے متعلق لکھا ہے:

"Goethe could not get away from the Greeks."
(Introduction, IX)

حقیقت یہ ہے کہ گوئٹے کو حکمائے یونان سے جو وابستگی تھی اس سے ہزاروں درجہ زیادہ وابستگی اقبال کو فکر اسلامی سے تھی انھوں نے سنہ ۱۹۳۶ء میں علوم اسلامیہ کے نصاب کے متعلق صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم

کے نام جو خط لکھا تھا، اس سے ایک طرف ان کی اس محبت اور شیفتگی کا پتہ چلتا ہے، جو انھیں علوم اسلامیہ سے تھی، اور دوسری طرف اس ذہنی اور مذہبی نصب العین کی تعیین ہوتی ہے، جو علامہ کے پیش نظر تھا، وہ چاہتے تھے کہ اسلامی تمدن اور موجودہ علوم کے درمیان حیات روحانی کے تسلسل کو قائم رکھا جائے، اور روحانی اور ذہنی کاوش کو ایک نئی وادی کی طرف مہمیز کیا جائے، اور ایک نئے دینیات و کلام اور حکمت کی تعمیر و تشکیل میں اس کو بروئے کار لایا جائے، اس غرض کے لیے انھوں نے جن جن شعبوں کے قیام کی تجویز پیش کی ہے اور جن جن کتابوں کے نام گنائے ہیں، ان سے علامہ کی پسند و ناپسند کا بخوبی پتہ چلتا ہے، علامہ کے خیال میں ان علوم کے بغیر نہ ملت کی روحانی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں، نہ نئی نسلوں کا ذہنی اور روحانی صحیح نظریہ متعین ہو سکتا ہے، اور نہ کسی خالص اسلامی تہذیب اور نظام فکر کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے، علامہ نے اپنی زندگی میں اس نصب العین کو حاصل کرنے کی پوری کوشش کی، ان کے افکار اور کلام میں علوم اسلامیہ کا بہترین خلاصہ موجود ہے، جو شاعرانہ زبان میں ہونے کی وجہ سے اگرچہ تلمیحی اور ایمائی حیثیت رکھتا ہے، لیکن ارباب فکر ان اشارات و کنایات کو کسی قدر کاوش کے ساتھ پوری طرح پھیلا سکتے ہیں، میری رائے میں ان علوم سے ابتدائی واقفیت کے علاوہ جو رہے ہیں ان حکمائے اسلام اور صوفیائے کرام کے تذکرہ کا جاننا بھی ضروری ہے، جن کے سرچشمۂ فیض سے فکر اقبال سیراب ہوتا رہا۔

رومی

ان میں سب سے پہلا نام مولانائے روم کا ہے، فکر اقبال کے ماخذ میں رومی کو سنگ بنیاد کی حیثیت حاصل ہے، اقبال رومی کو اپنا

ہادی اور پیشوا خیال کرتے ہیں' اور بار بار اعلان کرتے ہیں کہ بے سکیدے کی شراب دراصل پیرروم کے خمستان کی حاصل کردہ ہے' اقبال زندگی کے اسرار کی نقاب کشائی کرتے ہیں مگر اس انکشاف کا سہرا اپنے مرشد رومی کے سر باندھتے ہیں' یہی رومی جاوید نامہ کے زندہ رود کے لیے خضر راہ بنتے اور اُسے آسمانی دنیا کی طلسماتی فضا کی سیر کراتے ہیں' اور جب حکیم مشرق زندگی کے کلام کی تکمیل کر چکنے کے بعد اقوام شرق کو آخری پیغام دیتا ہے تو اس وقت اسی حکیم کی روح نوائے سروش بن کر مژدہ انقلاب لاتی ہے' یہ مولانا جلال الدین الرومی ہی ہیں جو اقبال کی نظر میں کلیم بھی ہیں' اور حکیم بھی' مجدد بھی ہیں اور مصلح بھی' شاعر بھی ہیں اور ساحر بھی ہیں' ولی بھی ہیں' اور مجذوب بھی طریقت کے دشوار گزار راستوں کے راہبر بھی ہیں' اور حقیقت کے رمزوں کے ہادی بھی' شریعت کے غوامض کے عقدہ کشا بھی ہیں' اور حکمت کے دقائق کے شارح بھی' غرض اقبال کے نزدیک ہماری موجودہ "کرم خوردہ" ملت کے تمام روحانی اور ذہنی امراض کو شفا بخشنے والا رومی ہے' جس کی تعلیمات کو اقبال نے اپنے افکار میں دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی ہے' اور یہ استغراق اس درجہ ہے کہ اقبال اپنے آپ کو "مثیل رومی" قرار دیتے ہیں' ان کے نزدیک عہد قدیم میں رومی ملت کیلئے پیغام حیات لائے تھے' اور اسی پیارا خوب دور حاضر میں وہ خود اس کے مبلغ اور داعی ہیں۔

اقبال کے نزدیک رومی کی زندگی اور ان کی حکمت کو جو اہمیت حاصل ہے' اس کے پیش نظر فکر رومی کی تدوین اور تشریح کرنا ہمارے لیے حد درجہ ضروری ہے' تاکہ اقبال کا مطالعہ کرنے والوں کو رومی کی صحیح

عظمت کا احساس ہو سکے۔ رومی کے فلسفے کی ممتاز خصوصیات سے دنیا کو روشناس کرائیں، اُن کے امتیازات اور دورِ جدید پر اس کے اثرات دکھانے کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے رومی کے اُن اشعار کی تشریح کی ضرورت ہے جو علامہ کی تصنیفات میں بڑی کثرت کے ساتھ آگئے ہیں تاکہ علامہ کے خیال کا سیاق و سباق سمجھ میں آسکے۔ مبتدیوں کے لیے اگرچہ اتنا ہی کافی ہے، لیکن اہلِ علم کا کام اس پر ختم نہیں ہو جاتا۔ اس سے رومی کے عمیق مطالعہ کی وسیع شاہراہیں ہمارے سامنے کھلتی ہیں، جو مطالعۂ اقبال کی نہایات میں سے ہے۔ خود علامہ نے بار بار ہمیں فکرِ رومی کی گہرائیوں میں ڈوب جانے کی ترغیب دی ہے۔

گسستہ تار ہے تری خودی کا ساز ابتک
کہ تو ہے نغمۂ رومی سے بے نیاز ابتک

اب تک جس قدر مضامین لکھے جا چکے ہیں، ان میں اقبال اور رومی کے مشترک خیالات پر بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے، جہاں تک مجھے معلوم ہے، شاید ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ہی ایک ایسے شخص ہیں، جنہوں نے اپنے مضمون "رومی نطشے اور اقبال" میں واضح طور پر ان خاص تصورات کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، جو اقبال نے رومی سے اخذ کیے ہیں۔ اسی طرح چند اور بزرگوں نے بھی اشارۃً اور ضمناً اس بنیادی مسئلے کی طرف توجہ کی ہے، لیکن اس مہتم بالشان بحث کے متعلق یہ اختصار بالکل ناکافی ہے، کیونکہ فکرِ رومی کی تجدید و ترویج ہی علامہ اقبال کے مقاصدِ زندگی میں تھی۔ ایسی حالت میں کیا شارحینِ اقبال کا سب سے ضروری فریضہ نہیں کہ وہ فکرِ اقبال کے طالبین کو حکمتِ رومی کے امتیازات

سے روشناس کریں تاکہ وہ اس کی روشنی میں علامہ اقبال کے افکار سے پوری طور سے آگاہ ہو سکیں۔ مشرق میں مولانائے روم کی مثنوی کو ابتدا سے اس قدر تقدس حاصل رہا ہے کہ عقیدت مندوں نے اُسے "قرآن در زبان پہلوی" کا خطاب دے کر آنکھوں اور دلوں میں جگہ دی۔ ایران، ترکی، عرب اور ہندوستان میں مثنوی کی بیسیوں شرحیں لکھی گئیں، خصوصاً ہندوستان میں مطالعۂ رومی کی طرف جتنی توجہ ہوئی اس کے مقابلے میں شاید ہی کسی اور کتاب کو پیش کیا جا سکے۔ عبداللطیف عباسی کی لطائف المعنوی، نواب شکراللہ خاں خاکسار کی شرح، ملا ایوب پارسا لاہوری، ملا سعید محمد عابد اور مولانا محمد افضل الٰہ آبادی کی شرحیں، اور بالآخر ملا بحرالعلوم کی تفسیر مثنوی اُن چند ممتاز شرحوں میں سے ہیں جو مثنوی رومی کے مطالعہ کے سلسلے میں تحریر میں آئیں۔ مثنوی رومی کے مطالعہ کی طرف سب سے زیادہ توجہ ہندوستان میں اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں ہوئی۔ نواب عاقل خاں رازی میر عسکری کو اسرار مثنوی کو حل کرنے میں خاص مہارت حاصل تھی۔ اس امیر کے زیر اثر مطالعۂ رومی کے شوق و ذوق کو بڑی ترقی ہوئی۔ عہد عالمگیری جیسا کہ باخبر حضرات سے پوشیدہ نہیں شدید سیاسی کشمکش کا زمانہ تھا۔ جس میں ہندوستانیوں کے طبائع شورش اور روحانی آشوب کی مخالفتوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے کسی نوشدارو کی جستجو میں تھے۔ ہیجان و اضطراب کے ان ایام میں شاید مطالعۂ رومی ہی وہ نوشدارو تھا، جس کے استعمال سے عہد عالمگیری کے لوگ اطمینان قلب حاصل کرتے تھے۔

پس علامہ اقبال نے ارشاد و ہدایت کے لیے جس برگزیدہ ہستی کو

کو منتخب کیا ہے، وہ اس امر کا بجا استحقاق رکھتی ہے کہ عالم انسانیت آفات و فتن کے اس نئے دور میں بھی اس کے تجویز کردہ نسخۂ شفا سے اپنے روحانی عوارض کا علاج کرے۔ موجودہ دور اپنے نتائج کے اعتبار سے ملت اسلامی اور مسلمانوں کے حق میں تاتاری دور سے کسی طرح کم نہیں، جس کی دشواریوں اور پرپیچ مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے علامہ اقبال نے مرشد رومی کے دامن سے منسلک کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ رومی کی حکمت "عقلیت" کی دشمن ہے اور دبستان دل کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اگر ہم کو رومی کے صفحات میں تجاذب اجسام اور تجدد امثال جیسے دقیق سائنٹفک مسائل بھی ملتے ہیں، لیکن اہل کشف و شہود کی بارگاہ میں ان ادنیٰ حقیقتوں کا علم کوئی خاص پایہ نہیں رکھتا، رومی کا سب سے بڑا امتیاز "عشق" کا جذب و سرور پیدا کرنا ہے، اور دور حاضر کے لیے سب سے زیادہ اسی کی ضرورت ہے۔

رومی کے متعلق بہت کچھ کہہ چکا اس سے زیادہ اس بحث کو طول دینے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ آخر میں پھر اسی کا اعادہ کروں گا کہ اقبال کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے رومی کو نہ صرف سمجھنا چاہیے بلکہ اس کو مقبول عام بنانا چاہیے، اور حکمت رومی کے ایسے دبستان قائم کرنے چاہئیں جن میں اسلامی حکمت و تصوف کے ماہرین فکر رومی کے قلزم زخار کی غواصی کریں اور جو کچھ اس تلاش و جستجو سے حاصل ہو اسے دنیا کے سامنے پیش کریں۔

سنائی اور عطار اقبال نے عطار اور سنائی سے بھی استفادہ کیا ہے سنائی سے زیادہ اور عطار سے کم۔ بال جبریل میں

وہ قطعہ آپ کی نظر سے گزرا ہوگا جو حکیم سنائی غزنوی کے مزار پر لکھا گیا تھا اور حکیم علیہ الرحمۃ کے ایک قصیدہ کے تتبع میں ہے۔ اس قطعے میں کتنا جوش، کتنا سرور اور کتنا سوز ہے۔ ہر ہر شعر سے جذبات کے طوفان امنڈ رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعرِ مشرق جب حکیم سنائی کے مزار پر پہنچا ہے تو سنائی کی عظمت اس کے پہنائے قلب پر چھا جاتی ہے اور رومی کا یہ مصرعہ بے ساختہ اس کی زبان پر جاری ہو جاتا ہے کہ

ع ما از پے سنائی و عطار آمدیم

"مسافر" میں بھی وہ نظم موجود ہے جس میں حکیم موصوف سے استصواب کرتے ہیں:-

حکیم سنائی سے علامہ اقبال کی عقیدت کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ حکیم علیہ الرحمۃ بھی سلسلہ رومی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ وہ بزرگ ہیں جن سے کسبِ فیض کا رومی کو خود اعتراف ہے بلکہ ان کے ہم سلسلہ ہونے پر فخر کا اظہار ہے۔ حکیم سنائی کی زندگی کے واقعات نفحات الانس وغیرہ میں بتفصیل موجود ہیں۔ جن سے حکیم علیہ الرحمۃ کے صاحبِ عرفان ہونے کا پورا پورا پتہ چلتا ہے۔ ان کی کتابیں حدیقۃ الحقیقۃ اور طریقۃ الحقیقۃ فارسی کی صوفیانہ شاعری کے لیے (Classics) اور بنیادی کتابوں کا درجہ رکھتی ہیں۔ خود شیخ عطار اور مولانا روم ان سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ یونیورسٹی لائبریری کی سابق ملازمت کے سلسلہ میں اس کا پورا علم ہے کہ علامہ اقبال اکثر حدیقہ اور اس کی

شرحوں سے استفادہ کیا کرتے تھے بلکہ ان کا ارشاد تھا کہ حدیقہ کی تعلیم کو ہمارے نظام تربیت میں خاص جگہ ملنی چاہئے۔

حدیقہ کیا ہے؟ اس میں کیا خاص اہم علمی و حکمی مسائل زیر بحث آئے ہیں؟ اور وہ کون سے نکات ہیں جو جدید علوم کی توضیح کے بعد حدیقہ کے ذریعہ زیادہ روشن اور واضح ہو سکتے ہیں؟ علامہ اقبال کو سنائی سے کیوں اس قدر دلچسپی تھی؟ یہ وہ باتیں ہیں جن کا جاننا ہر محب اقبال کے لیے ضروری ہے۔

سنائی کی طرح علامہ کو عطار سے بھی دلچسپی ہے، لیکن بہت زیادہ نہیں جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ عطار کی تصانیف بے شمار ہیں، اور کسی حد تک غیر دلچسپ، یونیورسٹی لائبریری میں مثنویات عطار کا جو قدیم نسخہ ہے اس میں ان کی کم و بیش چودہ تصانیف نظم موجود ہیں، اس نسخے کی ضخامت سات سو صفحات کے قریب ہے، مزید یہ کہ بہت سی مثنویاں عطار کی طرف غلط طور پر منسوب ہیں، اس کے علاوہ یہ سبب بھی ہے کہ سنائی اور عطار دونوں رومی کے سلسلۂ اساتذہ میں ہیں، اور ان کے خیالات کا بیشتر حصہ رومی نے اپنی مثنوی میں لے لیا ہے۔

تاہم عطار چونکہ اقبال کے اساتذۂ روحانی میں سے ہیں، اس لیے ان کی سوانح حیات، تصانیف اور افکار سے واقف ہونا خالی از فائدہ نہیں!

•

سعد الدین محمود شبستری

زبور عجم کا "گلشن راز جدید" شبستری کے گلشن راز کے جواب میں لکھا گیا ہے۔

شیخ شبستری فارسی انقلاب کے زمانہ کے بزرگ ہیں۔ اس دور میں خاک ایران نے جو بلند پایہ ہستیاں پیدا کیں ان میں سے ایک صاحب گلشن راز بھی ہیں۔ گلشن راز تصوف کی دقیق کتابوں میں سے ہے۔ علامہ نے اس کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے پھر اس کے پیغام کو نئے لباس میں ملبوس کرتے ہوئے گلشن راز جدید کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

اقبال اور شبستری کے فکر کے مقاماتِ اتصال کیا ہیں؟ اور وجوہ اختلافات کون سے ہیں؟ اقبال اور شبستری دونوں کا مطمح نظر کیا ہے؟ اور ان میں سے ہر ایک کس نئے انقلاب کا مدعی ہے؟ ان سب سوالات کا جواب مطالعۂ اقبال کے سلسلے میں ضروری ہے۔ میں نے اپنے ایک مضمون "اقبال اور شعرائے فارسی" میں ان سوالات کے جواب دینے کی کوشش کی ہے لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں گلشن راز کے بہت سے مسائل سمجھنے سے قاصر رہا۔

میں نے اس مضمون میں اختصار کے ساتھ اقبال کے اسلامی ماخذ کا ذکر کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ بحث اس درجہ دقیق اور پر از مسائل ہے کہ اس مختصر سے مضمون میں اس کے مبادی تک کا بھی تذکرہ نہیں ہو سکتا تاہم اس سے اتنا واضح ہو گیا ہوگا کہ حکمت اقبال کے اجزائے ترکیبی میں مسلمان صوفیوں اور حکماء کی حکمت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ پس اگر ہم چاہتے ہیں کہ اپنے دور کے حکیم اور عارف اقبال کی حکمت کا صحیح تجزیہ کر سکیں تو ہمیں علوم اسلامیہ اور فن فکر اس چمن فکر کی سیر کرنی چاہیے جس کے گلہائے رنگا رنگ سے گلشن اقبال کو

بے رونق حاصل ہوئی۔

حکمائے مشرق کی طرح اقبال نے حکمائے مغرب سے بھی بے حد استفادہ کیا ہے۔ مطالعۂ اقبال کے اس پہلو کے متعلق کچھ کام ہو چکا ہے لیکن ابھی رہ گئی ہے .... اس کے لیے فلسفۂ جدید کے عمومی واقفیت اور بعض بڑے بڑے فلسفیوں کے خصوصی اور غالب پہلوؤں سے واقف ہونا ضروری ہے، مثلاً نطشے، برگساں، ولیم جیمز، کانٹ، الگزینڈر، میک ٹیگرٹ وغیرہ۔

شاہد حسین رزاقی
(ایم۔ اے۔ عثمانیہ)

اقبال اور وطنیت

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

عہد حاضر کے عظیم ترین انسان اور شاعر اعظم حضرت علامہ اقبال مرحوم نوعِ انسانی کی ہمہ گیر تنظیم اور فلاح و نجاتِ انسانی کی تحریک کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ایسی تمام تحریکوں اور نظریوں کی شدید مخالفت کی ہے جو وحدتِ انسانی کے حصول میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں اور جن کی ترویج تمام انسانوں، بالخصوص مسلمانوں کے حق میں ایک لعنت ثابت ہوئی ہے۔ چونکہ اس قسم کے نظریات میں وطنیت اور جغرافی اور نسلی قومیت کے تصورات سب سے زیادہ تباہ کن ہیں اس لیے اقبال نے ان کی شدید ترین مخالفت کی اور ان کے بجائے اسلامی اصولوں پر عمل پیرا

ہونے کی تعلیم دی کیونکہ رنگ و نسل کے امتیازات اور قوم و وطن کے تعصبات کو ختم کرنے کے کامیاب ترین اصول اسلام نے پیش کئے ہیں اور وحدتِ انسانی کے حصول کی تمام توقعات اُمتِ مسلمہ ہی سے وابستہ ہیں۔

بعض کم فہم اشخاص جو اقبال کی اصلی تعلیمات کی حقیقت کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے اقبال پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ان کے مخاطب صرف مسلمان ہیں اور چونکہ ان کی شاعری کی اساس فرقہ وارانہ رجحانات ہیں اس لئے وہ قومیت اور وطنیت کے مخالف ہیں۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس ضمن میں یہ بات ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ صرف مسلمانوں کی ترقی و فلاح اور تعلیم و اصلاح کی کوششوں کو فرقہ واریت قرار دینے والے اشخاص اپنی تنگ نظری اور اسلامی تعلیمات کے بنیادی اصولوں سے لاعلمی کا ثبوت دیتے ہیں کیونکہ مسلمان کسی اعتبار سے بھی کسی قوم کا فرقہ نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ وہ ایک مستقل اور جداگانہ وحدت ہیں اور ان کی وحدت دوسری تمام وحدتوں سے اس قدر مختلف، وسیع تر بین الاقوامی اور عالمگیر ہے کہ اس کے مقابلہ میں قومیت کے دوسرے تمام تصورات وہی حیثیت رکھتے ہیں جو جدید قومیت کے مقابلہ میں قرونِ وسطیٰ کی قبیلہ بندی کو حاصل ہے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ خود اقبال مرحوم نے لکھا ہے یہ اعتراض اس اعتبار سے بھی بے بنیاد ہے کہ شاعری اور فلسفہ میں انسانی نصب العین ہمیشہ عالمگیر رکھا جاتا ہے لیکن اس نصب العین کی تحصیل جب عملی زندگی میں کی جائے گی تو لامحالہ اس کا آغاز کسی خاص جماعت سے ہوگا جو اپنا ایک مستقل اور مخصوص موضوع رکھتی ہو اور جس کے حدود میں اشاعتِ عمل و انسانی وسیع پیمانے پر ہو سکتی ہو۔ اقبال کے عقیدے میں یہ جماعت اسلام ہے کیونکہ نسلی امتیاز جو اقوام کے اتحاد اور

اشتراکِ عمل کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اس کی کامیاب ترین مخالفت اسلام نے کی ہے۔ اسلام اور نسلی و قومی امتیازات ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہ اصول نہ صرف اسلام بلکہ تمام عالمِ انسانیت کے سب سے بڑے دشمن ہیں اور جب اقبال نے یہ دیکھا کہ مسلمان بھی اپنے نصب العین کو چھوڑ کر قومیت اور وطنیت کے جال میں گرفتار ہو رہے ہیں تو بہ حیثیت ایک مسلمان اور محب بنی نوعِ انسان کے انھوں نے اپنا یہ فرض سمجھا کہ ارتقاءِ انسانیت میں مسلمانوں کو اُن کے اصل فرائض یاد دلائیں۔

اسلامی نظام کی تلقین اور وطنیت کی مخالفت کا درحقیقت یہی سبب ہے ورنہ جہاں تک کہ حبِ وطن کا تعلق ہے اقبال کو ہندوستان کے ہر ایک انقلابی اور قوم پرست شاعر سے بدرجہا زیادہ ہندوستان کی فلاح و بہبود اور اس کی آزادی سے محبت ہے اور اس کا بہترین ثبوت ان کی متعدد نظمیں ہیں۔ اس ضمن میں ان کے بے مثل شاہکار "جاوید نامہ" کا وہ حصہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس میں انھوں نے قلزمِ خونیں، روحِ ہندوستان اور اس کے نالہ و فریاد کا نقشہ پیش کیا ہے اور ملک و ملت کے غدار میر جعفر اور میر صادق کو ننگِ آدم، ننگِ دین، ننگِ وطن قرار دے کر ان کی روحوں کو اس قدر ذلیل تصور کیا ہے کہ دوزخ نے بھی ان کو قبول کرنا گوارا نہ کیا اور وہ ایک قلزمِ خونیں میں مبتلائے عذاب ہیں۔

علامہ اقبال کی شاعری کے ابتدائی دور میں قومیت کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے لیکن جب ان کی فکر و نظر میں زیادہ وسعت ہوئی اور انھیں اس حقیقت کا علم ہوا کہ مغربی نظریہ کا صدف گہر سے خالی ہے اور اس کے سب اصنام محض خیالی ہیں تو انھوں نے قومیت کی پستی سے نکل کر انسانیت کی بلندی

تک پہنچے اور تمام نوعِ انسانی و انسانیت کی فلاح و نجات کو اپنے پیغام کا موضوع بنایا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے اقبال نے اسلامی اصولوں کی تلقین کو اس لیے اپنا نصب العین قرار دیا کہ اسلام تمام نوعِ انسانی کو واحد اجتماعی تنظیم کے تحت منظم کرنے والا عالمگیر نظام ہے جو انسانیت کو رنگ و نسل اور قوم و وطن کی آلودگیوں سے پاک کر کے انسانی وحدت کی راہ ہموار کرتا ہے۔ لیکن تمام انسانوں کو اسلامی تنظیم میں داخل کرنا ایک ایسا زبردست کام ہے جس کی تکمیل کے لیے ایک مدت درکار ہے۔ چنانچہ اسلام نے اپنے نصب العین کی تکمیل تک صرف مسلم اور غیر مسلم کی تفریق روا رکھی ہے یعنی ایک وہ گروہ جو اسلامی نظام کا تابع ہے، اور دوسرا وہ گروہ جو اس نظام سے باہر ہے۔ درحقیقت یہی ایک ایسی تقسیم ہے جو عالمِ بشریت کو انسانی وحدت سے قریب ترین حد تک لے آتی ہے اور اس کے علاوہ نوعِ انسانی کی ہر تقسیم اسلام نے یکسر ختم کر دی ہے کیونکہ تفریق و تقسیم کے دوسرے تمام تصورات انسانوں کو منتشر کر کے انسانی وحدت کے حصول کو بعید تر کر دیتے ہیں۔ اسلامی نظام کا تابع گروہ یعنی ملتِ اسلامیہ یا امتِ مسلمہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی واحد اجتماعی تنظیم ہے اور اسے اس اعتبار سے فوقیت حاصل ہے کہ رنگ و نسل یا قوم و وطن کے ادنیٰ تعصبات کے بجائے تمام نوعِ انسانی کی اعلیٰ ترین اجتماعی تنظیم کے اصول اس کی اساس ہیں، اور انسانی وحدت کے حصول کا صرف یہی ایک عملی ذریعہ ہے۔ ملت یا امت کا تصور دوسرے تصورات سے اس اعتبار سے ممیز و ممتاز ہے کہ اس تنظیم کا مرکز اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کا آئین قرآن پاک ہے۔ اس کا رہنما خاتم المرسلین ﷺ ہے اور اس کا دائرۂ عمل سارا جہان ہے۔ اور اس طرح اس تنظیم کو نہ صرف حیاتِ دوام

حاصل ہو جاتی ہے بلکہ حریت، مساوات اور اخوت کے تصورات بھی اسی تنظیم میں روبہ عمل لائے جا سکتے ہیں۔ چونکہ ملت محمدیہ کی اساس توحید و رسالت ہے اس لیے وہ قید مکانی سے آزاد ہے اور اقبال نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ

جوہر ما با مقامے بستہ نیست — بادۂ تندش بجامے بستہ نیست
مسلم استی دل بہ اقلیمے مبند — گم مشو اندر جہان چون و چند
می نگنجد مسلم اندر مرز و بوم — در دل او یاوہ گردد شام و روم

ملت کی اس امتیازی حیثیت سے مسلمانوں کو باخبر کرنے کے لیے اقبال نے یہ کہا ہے کہ:۔

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
اُن کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

چونکہ وطنیت اور اس پر مبنی قومیت کا تصور اسلامی تعلیمات کے برعکس ہے اس لیے اقبال وطنیت کو مذہب کا کفن اور غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی قرار دے کر مسلمانوں کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ:۔

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانہ کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

اور وطنیت کی اس قدر مخالفت کا حقیقی سبب صرف یہی ہے کہ:۔

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے — قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

علامہ اقبال مرحوم نے وطنیت کے بارے میں اپنے خیالات ایک مضمون میں تفصیل سے بیان کیے ہیں، جو انھوں نے وطن کو ملت کی اساس قرار دینے والے اور مقامِ محمدی سے بے خبر ایک گمراہ عالم کے اعتراضات کے جواب میں لکھا تھا۔ اس مضمون میں اقبال نے ان تیرہ بخت مسلمانوں کی ذہنیت کا تجزیہ کیا ہے جو روحانی جذام میں گرفتار ہیں، اور انھیں فریب وطنیت سے محفوظ رکھنے کے لیے بہ صراحت فرمائی ہے کہ وطن ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا ایک اصول ہے اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے چونکہ اسلام بھی ہیئتِ اجتماعیہ کا ایک قانون ہے اس لیے جب لفظ وطن ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔ ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کی حیثیت سے اسلام ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر قسم کا دستور العمل جو غیر اسلامی ہو نا مقبول و مردود ہے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالمِ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص اسلامی ضمیر کی تخلیق کرے اسلام ہی نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی ہے اور نہ انفرادی یا خانگی بلکہ خالصتاً انسانی ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالمِ بشری کو متحد و منظم کرنا ہے۔ ایسا دستور العمل قوم و نسل پر مبنی نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس کو خانگی کہہ سکتے ہیں بلکہ اس کو صرف معتقدات پر ہی مبنی کیا جا سکتا ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے عالمِ انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی و

ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جو ایک امت کی تشکیل اور اس کی بقا کے لیے ضروری ہے اور اس سے علیحدہ رہ کر جو راہ اختیار کی جائے گی وہ راہ لادینی کی ہو گی اور شرف انسانی کے خلاف ہو گی۔ چنانچہ یورپ کا تجربہ ہمارے سامنے ہے کہ جب یورپ کی وحدت دینی پارہ پارہ ہو گئی اور مسیحیت قومی زندگی کی اساس بننے کے لیے موزوں نہ ثابت ہوئی تو اس کی اساس وطن کے تصور میں تلاش کی گئی اور یہ ظاہر ہے کہ اس اساس کا کیا انجام ہوا اور کیا ہو رہا ہے۔ جو مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بہ حیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں ان کو اقبال نے اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اول تو لادینی ہو گی اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پروائی ہو گی۔ وطنیت کا یہ تصور چند گمراہیاں بھی پیدا کر دیتا ہے۔ ایک تو یہ کہ بنی نوع انسان اقوام میں اسی طرح بٹے ہوئے ہیں کہ ان کا قومی اتحاد امکان سے خارج ہے دوسرے یہ کہ ہر ہر ملک کا دین اسی ملک کے لیے ہے اور دوسری اقوام کے طبائع کے موافق نہیں ان کے علاوہ یہ تباہ کن گمراہی بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ وطنیت کا نظریہ امت مسلمہ کی بنیادی سیاست کے کامل ہونے سے انکار کی راہ کھول دیتا ہے۔

اقبال نے نظریہ وطنیت کی تردید اس وقت شروع کی تھی جب دنیائے اسلام اور ہندوستان میں اس نظریہ کا کچھ ایسا چرچا ہی نہ تھا۔ کیونکہ یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ان کو ابتدا ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ عالم اسلام کی وحدت دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریہ وطنیت کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد اسلامی ممالک میں اس خدشہ کے ساتھ نظریۂ وطنیت کی اشاعت کی گئی کہ دنیائے اسلام کی وحدت ملی پر شدید ضرب لگی اور مسلمان بھی وطنیت اور قومیت کی لعنت میں گرفتار ہونے لگے۔ مسلمانوں کو اس تباہی سے محفوظ رکھنے کے لیے اقبال نے انہیں فریب وطنیت کی حقیقت سے آگاہ کیا اور خود یورپ کی مثال دے کر ثابت کیا کہ قومی وحدت ہرگز قائم و دائم نہیں ہے۔ وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے جو نسل، زبان، رنگ اور قوم سے بالاتر ہے اور اس وحدت کے حصول کا واحد ذریعہ صرف اسلامی اصول ہیں جب تک کہ جغرافیائی وطن اور رنگ و نسل کا امتیاز کالعدم نہ ہو جائے گا اور اس ناپاک قوم پرستی کے بت کو پاش پاش نہ کر دیا جائیگا انسان اس دنیا میں فوزو کامرانی کی زندگی بسر نہ کر سکے گا۔ وطنیت کا ناپاک تصور مسلمانوں کی وحدت ملی کو شکست کرکے ان کی تباہی کا ذریعہ بن رہا ہے اور اقبال نے مسلمانوں کو اس اہم حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے کہ ؎

رنگ کے خیر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن

اور اب دیکھنا یہ ہے کہ ؎

اس زمانہ میں کوئی حیدرِ کرار بھی ہے

علامہ اقبال

اقبال اور معاشیات

اقبال کی اولین کتاب "علم الاقتصاد" کا دیباچہ

علم الاقتصاد انسانی زندگی کے معمولی کاروبار پر بحث کرتا ہے اور اس کا مقصد اس امر کی تحقیق کرنا ہے کہ لوگ اپنی آمدنی کس طرح حاصل کرتے ہیں۔ اور اس کا استعمال کس طرح کرتے ہیں۔ پس ایک اعتبار سے تو اس کا موضوع دولت ہے اور دوسرے اعتبار سے یہ اس وسیع علم کی ایک شاخ ہے جس کا موضوع خود انسان ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ انسان کا معمولی کام کاج اس کے اوضاع و اطوار اور اس کے طرز زندگی پر بڑا اثر رکھتا ہے۔ بلکہ اس کے دماغی قویٰ بھی اس اثر سے کامل طور پر محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ تاریخ انسانی کے سیل رواں میں اصول مذہب بھی انتہا درجہ کا مؤثر ثابت ہوا ہے۔ مگر یہ بات بھی روزمرہ کے تجربے اور مشاہدے سے ثابت ہوئی ہے

کہ روزی کمانے کا دھندا ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور پیچھے پیچھے اُس کے ظاہری اور باطنی قویٰ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی یا یوں کہو کہ ضروریاتِ زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قوائے انسانی پر بہت برا اثر ڈالتی ہے بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلّا آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔

معلم اول یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدن انسانی کے قیام کے لیے ایک ضروری جزو ہے۔ مگر مذہب اور زمانۂ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوتِ مدارج بجائے اس کے کہ قیامِ تمدن کے لیے ایک ضروری جزو ہو اس کی تخریب کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظمِ عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کے دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لیے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے؟ اس سوال کا شافی جواب دینا علم الاقتصاد کا کام نہیں کیونکہ کسی حد تک اس کے جواب کا انحصار انسانی فطرت کی اخلاقی قابلیتوں پر ہے جن کو معلوم کرنے کے لیے اس علم کے ماہرین کو کوئی خاص ذریعہ اپنے ہاتھ میں

نہیں رکھتے۔ مگر چونکہ اس جواب کا انحصار زیادہ تر ان واقعات اور نتائج پر بھی ہے جو علم الاقتصاد کے دائرۂ تحقیق میں داخل ہیں اس واسطے یہ علم انسان کے لیے انتہا درجہ کی دلچسپی رکھتا ہے۔ اور اس کا مطالعہ قریباً قریباً ضروریات زندگی میں سے ہے بالخصوص اہل ہندوستان کے لیے تو اس علم کا پڑھنا اور اس کے نتائج پر غور کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ یہاں مفلسی کی عام شکایت ہو رہی ہے۔ ہمارا ملک کامل تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے اپنی کمزوریوں اور نیز ان تمدنی اسباب سے بالکل ناواقف ہے جن کا جاننا قومی فلاح اور بہبودی کے لیے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ انسان کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ جو قومیں اپنی تمدنی اور اقتصادی حالات سے غافل رہی ہیں ان کا حشر کیا ہوا ہے۔ ابھی حال میں مہاراجہ بڑودہ نے اپنی ایک گراں بہا تقریر میں فرمایا تھا کہ اپنی موجودہ اقتصادی حالت کو سنوارنا ہماری تمام بیماریوں کا آخری نسخہ ہے۔ اور اگر یہ نسخہ استعمال نہ کیا گیا تو ہماری بربادی یقینی ہے پس اگر اہل ہندوستان دفتر اقوام میں اپنا نام ثبت رکھنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس اہم علم کے اصولوں سے آگاہی حاصل کر کے معلوم کریں کہ وہ کون سے اسباب ہیں جو ملکی عروج کے مانع ہو رہے ہیں۔ میری غرض ان اوراق کی تحریر سے یہ ہے کہ عام فہم طور پر اس علم کے نہایت ضروری اصول واضح کروں اور نیز بعض بعض جگہ اس بات پر بھی بحث کروں کہ یہ عام اصول کہاں تک ہندوستان کی موجودہ حالت پر صادق آتے ہیں۔ اگر ان

سطور سے کسی فرد واحد کو بھی ان معاملات پر غور کرنے کی تحریک ہو گئی تو میں سمجھوں گا کہ میری دماغ سوزی اکارت نہیں گئی۔

اس دیباچے میں یہ واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کسی خاص انگریزی کتاب کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ اس کے مضامین مختلف مشہور اور مستند کتب سے اخذ کیے گئے ہیں اور بعض جگہ میں نے اپنی ذاتی رائے کا بھی اظہار کیا ہے۔ مگر صرف اسی صورت میں جہاں مجھے اپنی رائے کی صحت پر پورا اعتماد تھا۔ زبان اور طرز عبارت کے متعلق صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہوگا کہ میں اہل زبان نہیں ہوں۔ جہاں تک مجھ سے ممکن ہوا ہے میں نے اقتصادی اصولوں کے حقیقی مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور اردو زبان میں اس متین طرز عبارت کی تقلید کرنے کی کوشش کی ہے جو انگریزی علمی کتابوں میں عام ہے۔ نئی علمی اصطلاحات کے وضع کرنے کی دقت کو ہر بامذاق آدمی جانتا ہے۔ میں نے بعض اصطلاحات خود وضع کی ہیں اور بعض مصر کے عربی اخباروں سے لی ہیں جو زمانہ حال کی عربی زبان میں آج کل متداول ہیں۔ جہاں جہاں کسی اردو لفظ کو اپنی طرف سے کوئی نیا مفہوم دیا ہے ساتھ ہی اس کی تصریح بھی کر دی ہے۔ اس کتاب میں ایک آدھ جگہ انگریزی محاورہ کی تقلید میں میں نے اسم ذات کو اسم صفت کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے مثلاً سرمایہ سرمایہ داروں کے معنوں میں یا محنت محنتیوں کے معنوں میں۔ اگرچہ یہ محاورہ اردو پڑھنے والوں کو غیر مانوس معلوم ہوگا تاہم اس کے استعمال میں ایسی سہولت ہے جس کو بامذاق

لوگ خوب محسوس کر سکتے ہیں جہاں کئی فارسی محاورات کے لفظی تراجم اردو زبان میں مستعمل ہیں اگر اس لطیف محاورۂ انگریزی کا ترجمہ بھی مستعمل کر لیا جائے تو کیا حرج ہے۔

اصطلاحات کی نسبت ایک اور عرض یہ ہے کہ میں نے مانگ اور طلب دستکاری اور محنت دستکار اور محنتی نفع اور منافع۔ ساہوکار اور سرمایہ دار مالک کارخانہ دار مرادف استعمال کئے ہیں۔ پیدائش اور پیداوار کا استعمال ایک باریک فرق کو ظاہر کرتا ہے یعنی پیدائش سے مراد فعل کی ہے اور پیداوار سے مراد نتیجہ فعل کی علی ہذا القیاس لفظ "تبادلہ" اس کی جگہ استعمال کیا ہے جہاں مبادلہ اشیاء زر نقد کے وساطت سے کیا جائے اور لفظ "مبادلہ" اس موقع پر استعمال کیا ہے جہاں ایک شے دوسری شے کے عوض میں دی جائے۔ عربی زبان میں "مبادلہ" کا یہ مفہوم لفظ "مقایضہ" سے ظاہر کیا جاتا ہے مگر چونکہ یہ لفظ عام فہم نہیں ہے اس واسطے میں نے اس کے استعمال سے احتراز کیا ہے۔

اس دیباچہ کو ختم کرنے سے پیشتر میں استاذی المعظم حضرت قبلہ آرنلڈ صاحب پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جنھوں نے مجھے اس کتاب کے لکھنے کی تحریک کی اور جن کے فیضان صحبت کا نتیجہ یہ اوراق ہیں۔ میں استاذی جناب قبلہ لالہ جیا رام صاحب ایم۔ اے پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور اور اپنے عزیز دوست اور ہم جماعت مسٹر فضل حسین بی۔ اے کنٹب بیرسٹر ایٹ لا کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے مجھے نہ صرف اپنے بیش قیمت

کتب خانوں کی کتابیں ہی عنایت فرمائیں بلکہ بعض مسائل کے متعلق نہایت قابلِ قدر مشورات بھی دیئے۔ اس کے علاوہ مخدوم و مکرم جناب قبلہ مولانا شبلی نعمانی مدظلہٗ بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کے بعض حصوں میں زبان کے متعلق قابلِ قدر اصلاح دی۔

علامہ اقبال

محفلِ میلاد النبیؐ اور اقبالؒ

میلاد مبارک کی محفلوں کو ایک جماعت نے اپنے نادانشمندانہ غلو سے کام لیکر محض ایک مجموعہ رسوم بنا دیا ہے دوسری طرف اس کے مقابلہ میں ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی ہے جو سرے سے ان محفلوں ہی کو مٹا دینا چاہتی ہے۔ حضرت اقبال نے ایک موقع پر اس باب میں جو خیالات ظاہر فرمائے ہیں وہ انتہائی حد تک معقول و معتدل ہیں کہ ان کی تقریر کی رپورٹ کو "زمیندار" کے صفحات سے لے کر ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

(مرتب)

زمانہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ انسانوں کی طبائع اُن کے افکار اور نقطہائے نگاہ بھی زمانے کے ساتھ ہی بدلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا تیوہاروں کے

منانے کے طریقے اور مراسم بھی ہمیشہ متغیر ہوتے رہتے ہیں۔ اور ان سے استفادہ کے طریق بھی بدلتے رہتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم بھی اپنے مقدس دنوں کے مراسم پر غور کریں اور جو تبدیلیاں افکار کے تغیرات سے ہونی لازم ہیں اُن کو مدِ نظر رکھیں۔

منجملہ اُن مقدس ایام کے جو مسلمانوں کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں ایک میلاد النبیؐ کا مبارک دن بھی ہے۔ میرے نزدیک انسانوں کی دماغی اور قلبی تربیت کے لیے نہایت ضروری ہے کہ ان کے عقیدے کی رو سے زندگی کا جو نمونہ بہترین ہو وہ ہر وقت ان کے سامنے رہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے لیے اسی وجہ سے ضروری ہے کہ وہ اسوۂ رسولؐ کو مدِ نظر رکھیں۔ تاکہ جذبۂ تقلید اور جذبۂ عمل قائم رہے۔ ان جذبات کو قائم رکھنے کے تین طریقے ہیں۔ پہلا طریق تو درود و صلوٰۃ ہے۔ جو مسلمانوں کی زندگی کا جزو لاینفک ہو چکا ہے۔ وہ ہر وقت درود پڑھنے کے موقعے نکالتے ہیں۔ عرب کے متعلق میں نے سنا کہ اگر کہیں بازار میں دو آدمی لڑ پڑتے ہیں۔ اور تیسرا بہ آوازِ بلند اللّٰھم صلِ علیٰ سیدنا و بارک و سلم پڑھ دیتا ہے تو لڑائی فوراً رک جاتی ہے۔ اور متخاصمین ایک دوسرے پر ہاتھ اٹھانے سے فوراً باز آ جاتے ہیں۔ یہ درود کا اثر ہے۔ اور لازم ہے کہ جس پر درود پڑھا جائے اس کی یاد قلوب کے اندر اپنا اثر پیدا کرے۔

پہلا طریق انفرادی۔ دوسرا اجتماعی ہے۔ یعنی مسلمان کثیر تعداد میں جمع ہوں اور ایک شخص جو حضورِ آقائے دو جہاں صلعم کے سوانحِ حیات سے پوری طرح باخبر ہو آپؐ کے سوانحِ زندگی بیان کرے تاکہ ان کی تقلید کا ذوق شوق مسلمانوں کے قلوب میں پیدا ہو۔ اس طریق پر عمل پیرا ہونے کیلئے

ہم سب آج یہاں جمع ہوئے ہیں۔

تیسرا طریق اگرچہ مشکل ہے، لیکن بہرحال اس کا بیان کرنا نہایت ضروری ہے وہ طریقہ یہ ہے کہ یاد رسولؐ اس کثرت سے اور ایسے انداز میں کی جائے کہ انسان کا قلب نبوت کے مختلف پہلوؤں کا خود مظہر ہو جائے یعنی آج سے تیرہ سو سال پہلے جو کیفیت حضور سرور عالمؐ کے وجود مقدس سے ہویدا تھی، وہ آج تمہارے قلوب کے اندر پیدا ہو جائے۔ حضرت مولانا روم فرماتے ہیں۔

آدمی دید است باقی پوست است
دید آنست آنکہ دید دوست است

یہ جوہر انسانی کا انتہائی کمال ہے کہ اُسے دوست کے سوا اور کسی چیز کی دید سے مطلب نہ رہے۔ یہ طریقہ بہت مشکل ہے۔ کتابوں کے پڑھنے یا میری تقریر سننے سے نہیں آئے گا۔ اس کے لیے کچھ مدت نیکوں اور بزرگوں کی صحبت میں بیٹھ کر روحانی انوار حاصل کرنا ضروری ہے۔ اگر یہ میسر نہ ہو تو پھر ہمارے لیے یہی طریقہ غنیمت ہے جس پر ہم آج عمل پیرا ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اس طریق پر عمل کرنے کے لیے کیا کیا جائے؟ پچاس سال سے شور برپا ہے کہ مسلمانوں کو تعلیم حاصل کرنی چاہیے لیکن جہاں تک میں نے غور کیا ہے تعلیم سے زیادہ اس قوم کی تربیت ضروری ہے اور قومی اعتبار سے یہ تربیت علما کے ہاتھ میں ہے۔ اسلام ایک خالص تعلیمی تحریک ہے۔ صدر اسلام میں سکول نہ تھے۔ کالج نہ تھے۔ یونیورسٹیاں نہ تھیں لیکن تعلیم و تربیت اس کی ہر چیز میں ہے۔ خطبۂ جمعہ خطبۂ عیدین،

بج، وعظ غرض تعلیم و تربیت عوام کے بیشمار مواقع اسلام نے بہم پہنچائے ہیں، لیکن افسوس کہ علمار کی تعلیم کا کوئی صحیح نظام قائم نہ رہا۔ اور اگر کوئی رہا بھی تو اس کا طریق عمل ایسا رہا کہ دین کی حقیقی روح نکل گئی جھگڑے پیدا ہو گئے، اور علمار کے درمیان جنھیں پیغمبر علیہ السلام کی جانشینی کا فرض ادا کرنا تھا سر پھٹول ہونے لگی۔ مصر عرب، ایران، افغانستان ابھی تہذیب و تمدن میں ہم سے پیچھے ہیں لیکن وہاں علمار ایک دوسرے کا سر نہیں پھوڑتے۔ وجہ یہ ہے کہ اسلامی ممالک نے اخلاق کے اس معیار اعلیٰ کو پا لیا ہے۔ جس کی تکمیل کے لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مبعوث ہوئے۔ اور ہم ابھی اس معیار سے بہت دور ہیں۔

دنیا میں نبوت کا سب سے بڑا کام تکمیل اخلاق ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے فرمایا۔ بعثت لاتمم مکارم الاخلاق یعنی میں نہایت اعلیٰ اخلاق کے اتمام کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ اس لیے علمار کا فرض ہے کہ وہ رسول اکرمؐ کے اخلاق ہمارے سامنے پیش کیا کریں۔ تاکہ ہماری زندگی حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کی تقلید سے خوشگوار ہو جائے اور اتباع سنت زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزوں تک جاری و ساری ہو جائے۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے خربوزہ لایا گیا تو آپ نے کھانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے معلوم نہیں رسول اللہؐ نے اس کو کس طرح کھایا ہے۔ مبادا میں ترک سنت کا مرتکب ہو جاؤں ؂

کامل بسطام در تقلید فرد
اجتناب از خوردن خربوزہ کرد

افسوس کہ ہم میں بعض چھوٹی چھوٹی باتیں بھی موجود نہیں ہیں جن سے ہماری

زندگی خوشگوار ہو اور ہم اخلاق کی فضا میں زندگی بسر کر کے ایک دوسرے کے لیے باعثِ رحمت ہو جائیں۔ اگلے زمانے کے مسلمانوں میں اتباعِ سنت سے ایک اخلاقی ذوق اور ملکہ پیدا ہو جاتا تھا اور وہ ہر چیز کے متعلق خود ہی اندازہ کر لیا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رویہ اس چیز کے متعلق کیا ہوگا۔

حضرت مولانا روم بازار میں جا رہے تھے۔ آپ کو بچوں سے بہت محبت تھی۔ کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ ان سب نے مولانا کو سلام کیا اور مولانا ایک ایک کا سلام الگ الگ قبول کرنے کے لیے دیر تک کھڑے رہے۔ ایک بچہ کہیں دور کھیل رہا تھا۔ اس نے وہیں سے پکار کر کہا کہ حضرت ابھی جائیے گا نہیں میرا سلام لیتے جائیے۔ تو مولانا نے بچہ کی خاطر دیر تک توقف فرمایا اور اس کا سلام لے کر گئے۔ کسی نے پوچھا حضرت آپ نے بچہ کے لیے اس قدر توقف کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر رسول اللہ صلعم کو اس قسم کا واقعہ پیش آتا تو حضورؐ بھی یونہی کرتے۔

گویا ان بزرگوں میں تقلیدِ رسولؐ اور اتباعِ سنت سے ایک خاص اخلاقی ذوق پیدا ہو گیا۔ اس طرح کے بیشمار واقعات ہیں۔ علما کو چاہیے کہ ان کو ہمارے سامنے پیش کریں۔ قرآن و حدیث کے نوامیس بتانا بھی ضروری ہے۔ لیکن عوام کے دماغ ابھی ان مطالب عالیہ کے متحمل نہیں انھیں تو فی الحال صرف اخلاقِ نبویؐ کی تعلیم دینی چاہیے۔

مولوی نذیر الحق میرٹھی

عقیدۂ توحید اور اقبال

ہست پیغامش دو جہاں لا الٰہ ساز مارا پردہ گرداں لا الٰہ
لا الٰہ سرمایۂ اسرار ما پردہ بند از شعلۂ افکار ما

دین کے بنیادی اصول تین ہیں۔ انبیا علیہم السلام نے ان ہی اصولوں کی دعوت دی اور ان ہی اصولوں پر نوع انسان کی دینی و دنیوی بہتری، بھلائی، کامیابی، ترقی اور نجات کا دارومدار ہے۔ قرآن پاک نے ان اصولوں کے متعلق جو تفصیل و تشریح دی ہے وہ اس قدر فطری، عقلی، کامل اور جامع ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب اس کی نظیر لانے سے قاصر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اسلام کو دنیا کا آخری اور کامل ترین مذہب مانتے ہیں۔

دین کا پہلا اصل اور بنیادی عقیدہ خدا پر ایمان لانا ہے، لیکن دنیا بھر کی قومیں اسی اصل میں صحیح راستے سے دور جا پڑی ہیں اور وہ خدا کی ذات و صفات کے متعلق ایسا گھٹیا درجہ کا تصور رکھتی ہیں کہ اس کا خلاف عقل و فطرت

جو ناہر سلیم الفطرت انسان بادنیٰ تامل معلوم کر سکتا ہے۔

اسلام سے پہلے انسان کا یہ حال تھا کہ وہ دنیا کے ذرہ ذرہ کو خدا سمجھتا تھا۔ تاریخ انسانی بتلاتی ہے کہ تمام نوع انسانی کے اندر ایک بلند و بالا ہستی کا اقرار و اعتراف تو موجود رہا کہ اس کا احساس وجدانی طور پر فطرت انسانی کے اندر موجود ہے لیکن گوناگوں اسباب واثرات فطرت انسانی پر قسم قسم کے پردے ڈالتے اور اسے کچھ سے کچھ بنا دیتے رہے اور یہ فطری تصور اقوام و مذاہب نے قسم قسم کے پردوں اور لباسوں میں گم کر کے رکھ دیا اور خود ساختہ و خیالی معبودوں کے پجاری بن گئے۔

اس سلسلہ میں قرآن کریم نے جو اولین پیغام نوع انسانی کو دیا وہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہے۔ اس کلمہ کے دو حصے ہیں۔ ایک سلبی یعنی اس امر کا یقین کہ دنیا میں کوئی طاقت ایسی نہیں جسے آقا، مالک، حکمران اور مربی تسلیم کیا جائے جس کی غلامی اختیار کی جائے اور جسے حاجات کا قبلہ مقصود بنایا جائے۔ یہ نفی کا پہلو ہے۔ یعنی پہلے سے ذہن میں جو کچھ ہو اسے مٹا دیا اور بھلا دیا جائے جب ذہن یوں صاف ہو جائے تو پھر اس میں اللہ کا تصور بٹھایا جائے اور اعمال کی ایک نئی عمارت کھڑی کی جائے۔ یہ ایجابی پہلو ہے۔ کہ تمام قوتوں کے انکار کے بعد صرف معبود حقیقی کی غلامی اختیار کی جائے۔ تمام ذہنی فرضی وہمی اور خیالی معبودوں اور قوتوں کو راستے سے ہٹا کر خدا اور بندے کا براہ راست تعلق پیدا کر دیا جائے۔

اس طرح جب ایک انسان عقل انسانی کے تراشے ہوئے خداؤں کی تخریب پر آمادہ ہو گیا۔ تو اس نے لا پر عمل اور راہ توحید پر قدم اٹھایا مگر اب لغزش کا مقام آگیا۔ جہاں ممکن ہے کہ محسوسات کا خوگر انسان مجبور ہو۔

ہیچ ترغیب کو حقیقت اور باطل کو حق سمجھ بیٹھے اپنی فطرت صالحہ کو مسخ کر لے اور حقیقت مجردہ کو خارجی پردوں اور لباسوں میں گم کر دے دنیا کے تمام مذاہب و مسالک اسی غلطی میں گرفتار ہیں اس مشکل مقام پر "الا" ذہن انسانی کو گمراہی سے بچاتا اور محسوسات کے پردوں کو چاک کر کے حقائق حسن و عشق تک پہنچاتا ہے۔ اگر اس تخریب و تعمیر میں "لا" "الا" سے بیگانہ ہو جائے۔ یعنی آپ پتھر کے بتوں سے خدائی منصب چھین کر انہیں آپ انسانوں کو الوہیت کے مقام تک پہنچا دیں یا کسی فرعون کے ہاتھ سے زمامِ اقتدار چھین کر کسی کمزور کے ہاتھ میں دے دیں تو گویا آپ نے ایک باطل کو مٹا کر اس کی جگہ دوسرا باطل قائم کر دیا آج امتِ مسلمہ مذہبیات و سیاسیات کے اسی چکر میں پھنسی ہوئی ہے۔ حضرت اقبالؒ اس چیز کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

نہادِ زندگی میں ابتدا لا انتہا الا — پیامِ موت ہے جب لا ہوا الا سے بیگانہ
وہ ملت روح جس کی لا سے آگے بڑھ نہیں سکتی — یقیں جانو ہوا لبریز اس ملت کا پیمانہ

ذرا غور فرمائیے علامہ مرحوم نے ان دو شعروں میں ذہن انسانی کو کہاں کہاں پہنچانا چاہا ہے۔ کیا ہماری قوم اسی بے مرگ آور نیند کے مزے نہیں لوٹنے لگی کہ اس نے "لا" کو "الا" سے بیگانہ و بے تعلق کر دیا۔ نام نہاد مسلمان زبان سے لا الہ الا اللہ کہتے رہے اور دل کو صنم خانہ بنا لیا وہ بڑی سادگی کے ساتھ اس کلمہ کو پڑھ جاتے ہیں مگر اس بات کو محسوس تک نہیں کرتے کہ اس فیصلہ کن اقرار کا عقلی اقتضا کیا ہے اور اس جملے کے تقاضے و مطالبات کیا ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ ؎

تحزب پیدا ہو گیا توحید رخصت ہو گئی — بے زری ہاتھی جرو طریقت ہو گئی

اقبالؔ وہ پہلا شخص ہے جس نے اپنی فلسفیانہ شاعری میں معقول و مدلل اور دلنشین پیرایہ میں اس لمحہ کے جو مقتضیات و مطالبات کو پیش کرکے امت مسلمہ کو ایک نئی زندگی کی دعوت دی ہے اور مسلمانوں کے دل و دماغ کو مسلمان بنانا چاہا ہے۔

اقبالؔ کے نزدیک تعلق باللہ کی حقیقت تک پہنچنا گویا عروج انسانی کا کمال ہے اور خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنھوں نے اس گوہر مقصود کو پالیا۔ وہ کہتا ہے اس متاع بے بہا کا حصول ہدایت آسمانی کی روشنی اور اتباع نبوت کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ حقیقت دیکھنے کی چیز ہے سمجھنے کی نہیں۔ قرآن حکیم نے ایمان بالغیب کے فلسفہ میں انسانی عقل و ادراک کی کمزوری و نارسائی کا اعلان کرتے ہوئے دنیا والوں کو جتلا دیا ہے کہ خدا شناسی ذہنی و ادراکی کیفیت کا نام نہیں بلکہ روحانی مشاہدے کی تعبیر ہے چنانچہ مرید ہندی پیر رومی سے اس سلسلہ میں استفسار کرتے ہیں کہ انسانی ارتقاء کا مقصود منتہی علم حقیقت ہے یا دیدار حقیقت؟

خاک تیرے نور سے روشن بصر　　غایت آدم خبر ہے یا نظر

اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے ؎

آدمی دید است باقی پوست است　　دید آں باشد کہ دید دوست است

انسانی زندگی پر عقیدۂ توحید کا اثر

لا الٰہ الا اللہ کے اقرار سے انسان پر ایک وجد آور کیفیت طاری ہو جاتی ہے

اس سلسلہ میں اقبالؔ نے سب سے پہلے اس چیز کو ذہن نشین کرایا ہے کہ اسلام کی تعلیم میں ایمان باللہ سب سے اہم اور بنیادی چیز ہے۔ یہ اسلامی عقائد و احکام کا مرکز، اس کی جڑ اور اس کی قوت کا منبع ہے۔ اسلام کے تمام قوانین اسی ایک بنیاد پر قائم ہیں اور سب کو اسی مرکز سے قوت پہنچتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

در جہاں از و حکمت از و آئیں از و　　زور از و قوت از و تمکیں از و

یہ کلمہ انسان کو اس کے اصلی مقام سے واقف کرتا ہے۔ اس میں انتہا درجہ کی خودداری اور عزتِ نفس پیدا کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ اس پر اعتقاد رکھنے والا جانتا ہے کہ انسان تمام مخلوقات کا آقا ہے وہ تمام مخلوقات سے اشرف ہے۔ مخلوقات میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کو انسان اپنا خدا بنائے اور کسی کے آگے جھکے۔ صرف ایک خدا ہی تمام طاقتوں کا مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی نفع و نقصان پہنچانے والا نہیں۔ موت و حیات، عزت و ذلت اور نفع و نقصان سب کچھ اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔ پس اس کی گردن کسی مخلوق کے آگے نہیں جھک سکتی۔ فرماتے ہیں ؎

آنکہ ذاتش واحد است و لاشریک — بندہ اش ہم در نسازد با شریک
مومن بالائے ہر بالاترے — غیرتِ او بر نتابد ہمسرے

ایک مومن کی شان یہ ہے کہ اس کا سر سوائے خدا کے اور کسی کے سامنے نہ جھکے ؎

پیش فرعونے سرش افگندہ نیست — ما سوی اللہ را مسلماں بندہ نیست

اس لیے کہ دنیا کی ہر چیز اس کے لیے ہے اور وہ کسی کے لیے نہیں ؎

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

متاعِ دنیا کے فلسفہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ دنیا ایک متاع ہے۔ اب یا تو اس کی غلامی میں عمر بسر کی جائے یا اُسے اپنے قبضہ و اختیار میں لے لیا جائے اور دنیا کے انسانوں کو انسانوں کی غلامی و بادشاہی سے نکال کر خدا کی حکومت و بادشاہی میں لے آیا جائے۔ اقبال کہتا ہے۔ ؎

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث

مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

عقیدۂ توحید انسان میں احساسِ خودداری اور عزتِ نفس کو کتنا ابھارتا ہے ؎

مسلم استی بے نیاز از غیر شو — اہلِ عالم را سراپا خیر شو
پیشِ منعم شکوۂ گردوں مکن — دستِ خویش از آستیں بیروں مکن
چوں علیؓ در ساز با نانِ شعیر — گردنِ مرحب شکن خیبر بگیر
منت از اہلِ کرم بردن چرا — نشترِ لا و نعم خوردن چرا
رزقِ خود را از کفِ دوناں مگیر — یوسف استی خویش را ارزاں مگیر

قرآن مجید کی رو سے موحد وہ ہے جو صرف ایک ہی ذاتِ عالم الغیب خدا پر ایمان رکھتا ہو اور اس کے سوا کسی کو اپنا خالق، مالک، حاکم، رازق کفیل، کارساز، دستگیر، حافظ ناصر اور مستعان نہ سمجھتا ہو اور صرف اسی ایک کا ہو جائے ؎

چوں مقامِ عبدہٗ محکم شود — کاسۂ دریوزہ جامِ جم شود
قوم را اندیشہا باید یکے — در ضمیرش مدعا باید یکے

اگر مسلمانوں کی نظروں سے فکر و عمل کی یہ بلندی اوجھل ہو جائے تو ان کی زندگی سے موت اچھی ہے ؎

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

لا الٰہ الا اللہ کا اعتقاد سوائے خدائے واحد کے کسی کو حکومت کا حق نہیں دیتا۔ اس اعتقاد کی رو سے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ذات خود انسانوں کا حکمران

بن جائے پس اس اعتقاد کی رو سے خدا کے سوا کسی کی غلامی جائز نہیں ہے

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

یہی وجہ ہے کہ اقبال اس ترقی اور آزادی کا طالب نہیں جو حکمراں عطا کریں ہے

خریدے نہ جس کو وہ اپنے ہوئے مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

وہ اس آزادی کو آزادی نہیں سمجھتا جو ہر فرد بشر کو شتر بے مہار

بنا دے ہے

اس قوم کی ہے خوئے اندیشہ خطرناک جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد

اقبال کو محض وہ ترقی اور آزادی مطلوب ہے جو اسلام کے ذریعہ حاصل کی جائے اور جس کی بنیاد اس اعتقاد پر ہو کہ "مسلم خدا کے سوا کسی کا محکوم نہیں" ہے

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر

مری دانش ہے افرنگی مرا ایمان ہے زناری

پس اگر مسلمانوں کو ترقی اور آزادی مطلوب ہے تو انھیں چاہئے کہ اپنے اندر توحید کی روح پیدا کریں اور دنیا کے موجودہ شیطانی نظام کو تہ و بالا کر دیں ہے

تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

ہر نئی تہذیب کو لازم ہے تخریبِ تمام ہے اسی میں مشکلات زندگانی کی کشود

لا الٰہ الا اللہ نے مسلمانوں کو یہی سبق سکھایا ہے کہ وہ دنیا سے غیر اللہ کی حاکمیت و حکومت مٹا کر حکومتِ الٰہی کو قائم کریں ہے

منعم! بجہاں آئندہ مردِ حق ہے خلیل پ گفتہ وہ ہر جو پوشیدہ لا الہ میں ہے

انقلابی کلمہ

اقبال جانتا ہے کہ صدیوں سے مسلمان اس چیز کو بھولے ہوئے ہیں کہ اسلام ایک انقلابی نظریہ و مسلک کا نام ہے، اور دنیا کے تمام ظالمانہ اور مفسدانہ نظامات کو مٹا کر اُن کی جگہ اپنا ایک اصلاحی پروگرام نافذ کرنا چاہتا ہے، اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا حقیقی مدعا و مقصود یہی ہے۔ اس لیے وہ مسلمانوں کو یہی مقصود و مدعا سمجھاتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ خدا ان کی ہی مدد کیا کرتا ہے جو دستِ سوال نہیں بلکہ دستِ طلب بڑھائیں، سرورِ دین و جہانبانی اُنہی کے لیے ہے جو جد و جہد اور سعی کرتے ہیں، جو جانی اور مالی قربانیاں کرنا اور پہاڑوں سے ٹکرا جانا جانتے ہیں، جو زمانہ کی رَو کے ساتھ ساتھ نہیں بہتے بلکہ نامساعد حالات اور ناموافق ماحول کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔ اسی لیے وہ کہتا ہے ؂

حدیثِ بے خبراں ہے تو بازمانہ بساز ۔۔۔ زمانہ با تو نسازد تو بازمانہ ستیز

اس مقام پر پہنچ کر اقبال دیکھتا ہے کہ قریب قریب اسلام کے تمام نام نہاد مفکر اور کشتیٔ اسلام کے ناخدا اس چیز کو بھولے ہوئے ہیں کہ اسلام ایک انقلابی نظریہ و مسلک ہے اور وہ زمانہ سے جنگ آزما ہونے کے بجائے قوم کو یہ درس دے رہے ہیں "چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی" یہ دیکھ کر اس کے سینے سے اک آہ نکلتی ہے اور وہ چیخ اُٹھتا ہے ؂

چنیں دورِ آسماں کم دیدہ باشد ۔۔۔ کہ جبریلِ امیں را دل خراشد

چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا ۔۔۔ پرستد مومن و کافر تراشد

وہ اسلام کے رہنماؤں کو ایک انوکھی ڈانٹ دیتا ہے ؂

فتادی از مقامِ کبریائی ۔۔۔ حضورِ دوں نہاداں سر نہادی

سجودے آوری دارا و جم را مکن اے بے خبر رسوا حرم را

مسلمانوں کے جو زعما انگریز کی گود میں سو جانا چاہتے ہیں ان سے کہتا ہے ؎

مبر پیش فرنگی حاجت خویش ز طاق دل فرو ریز این صنم را

ان کے مقابلہ میں جو لوگ اپنے آپ کو کانگریس کے رحم و کرم پر چھوڑ رہے ہیں ان سے پوچھتا ہے ؎

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

جب ان سیاسی قائدوں کا جائزہ لے کر وہ صوفی و ملا کی بارگاہ عالی میں پہنچتا ہے تو اسے نظر آتا ہے کہ اللہ والے عزلت و تنہائی کے گوشوں میں بیٹھے ہوئے نذر و نیاز کے سلسلہ میں گم ہیں اور حال و قال و سماع و وجد کی محفلیں گرم ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ مردوں کو بھی دنیا کی جدوجہد میں حصہ لینے سے روک رہے ہیں۔ زندگی کی کشمکش سے دور بیٹھے ہیں اور ہاتھ پاؤں توڑ کر ایک جگہ بیٹھ رہنے کی تلقین کر رہے ہیں۔ جب وہ ان اللہ والوں میں بھی مرد مومن کی نگاہ اور مسلم کا عزم و ہمت نہیں دیکھتا تو ان سے بھی بیزار ہو جاتا ہے اور کہتا ہے ؎

نہ با صوفی نہ با ملا نشینم تو میدانی کہ من آنم نہ اینم
نویس اللہ بر لوح دل من کہ ہم خود را ہم او را فاش بینم

جو لوگ ان بدعتوں کی خرافات و واردات کے جنگل میں پھنس کر اپنی دنیا اور آخرت برباد کر رہے ہیں ان کی آنکھیں کھولنے کے لیے کہتا ہے ؎

نماز و روزہ و قربانی و حج یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

آہ! اسلام کی وہ روح وہ حقیقت کہاں جس کا سبق لا الٰہ الا اللہ میں دیا گیا ہے۔ ؎

قلندر جز دو حرفِ "لا الٰہ" کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

پوری قوم کو اپنے مقام سے یوں گرا ہوا دیکھ کر ہمارا شاعر مایوس نہیں ہوتا۔ بلکہ کہتا ہے ؎

اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

وہ شعیب سے بھی کہتا ہے کہ راہی کی کم کوشی دیکھ کر مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ ؎

نومید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

بلند خیال اقبال راہی کی کم کوشی سے مطلق ہراساں نہیں ہوتا کہتا ہے ؎

جہاں تو ہو رہا ہے پیدا وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ
ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

آہ! آج اقبال ہم میں نہیں جس نے ہمیں درسِ توحید دے کر ہماری ہمتوں کو یوں بلند کیا تھا اور صراطِ مستقیم سمجھائی تھی۔ ان دو چار ایسے مردانِ حق آگاہ ہماری قوم میں اب بھی موجود ہیں جو تند و تیز ہوا میں اپنے چراغ جلا رہے ہیں اب اگر قوم کی فطری صلاحیتیں بالکل مفقود نہیں ہو گئی ہیں تو وہ اُن مردانِ کار کو

ڈھونڈ لے۔

خلاصہ اِنی اباب یہ کہ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کو لا الٰہ الا اللہ کی تفسیر کتابوں میں پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے نزدیک شہادت حسین اسی کلمۂ طیبہ کی زندہ تفسیر ہے۔ امام عالی مقام نے اپنے طرزِ عمل سے مسلمانوں کو اس کلمہ کے حقیقی معنی سے آگاہ کر دیا اور وہ یہ ہیں کہ خدا کے سوا کسی کی اطاعت نہ کرو۔ خدا کے سوا کسی سے مت ڈرو۔ جو تم کو خدا کی اطاعت سے ہٹانا چاہے اس کا مقابلہ کرو اور جان تک دیدو۔ یہی توحید کے حقیقی معنی ہیں ؎

نقش الا اللہ بر صحرا نوشت سطرِ عنوانِ نجاتِ ما نوشت

بس اسی میں مسلمانوں کی عظمت کا راز مضمر ہے۔ اور یہی نجاتِ اخروی کی کنجی ہے علامہ اقبالؒ نے اس نکتہ کو دو لفظوں میں یوں سمجھا دیا ہے ؎

ما سخن توحید را بر دل زدن
وا نمودن خود را بر مشکل زدن

تمت